

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224888

UNIVERSAL
LIBRARY

سالنامہ بزمِ اردو

جامعہ عثمانیہ

۳۳۳ اف
بابتہ

پیشکش

مہر سعادت علی رضوی بی۔ اے

(صدر بزمِ اردو)

R
۳۷۱۶۵۴
۱۳۴۳
۲۱

سالنامہ بزم اردو

جامعہ عثمانیہ

۱۳۲۳ ف
بابۃ

مُتَبَّعٌ

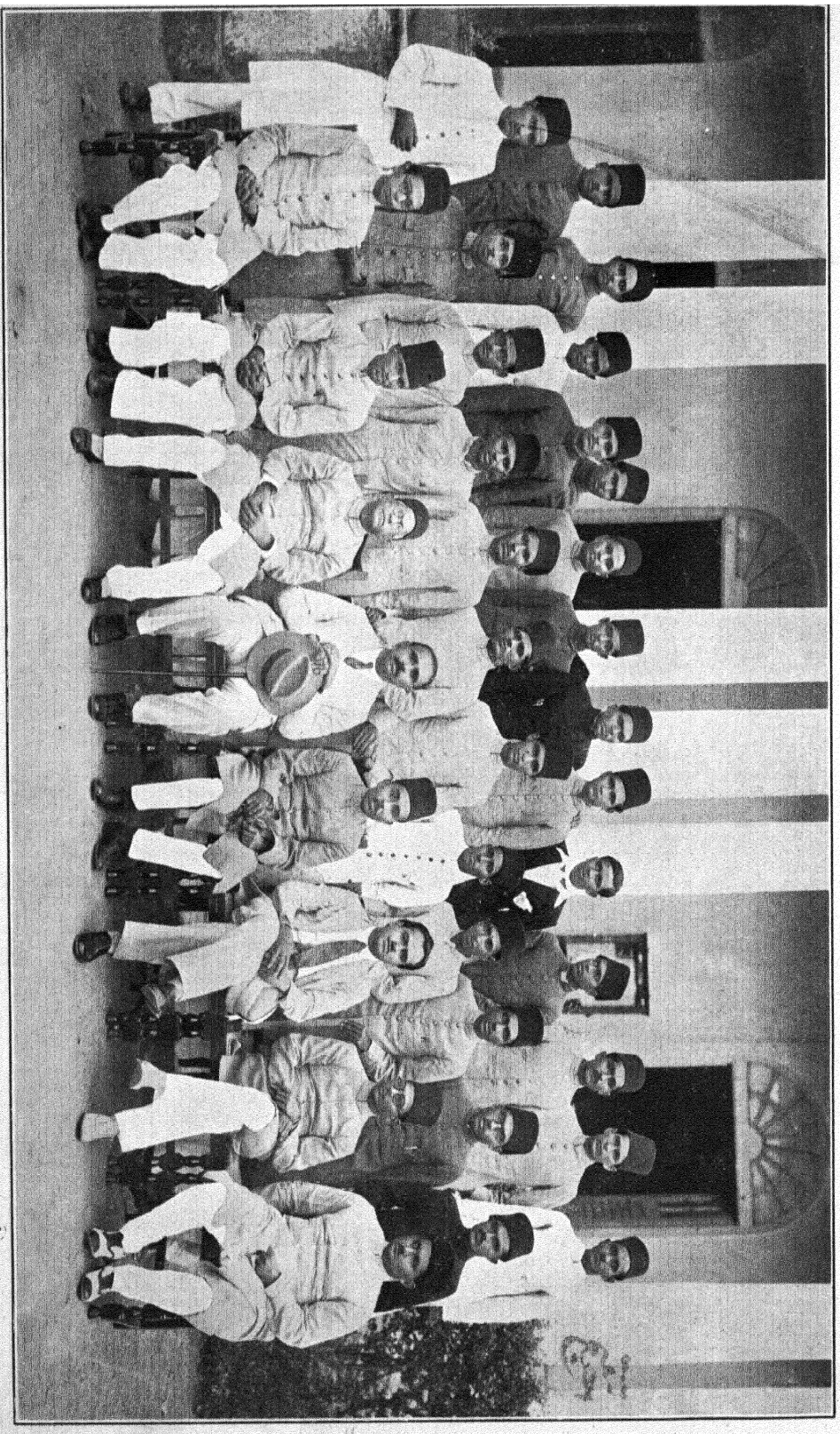
میرسعادت علی رضوی بی۔ ۱۔ ۷

صدر بزم اسراء و

کرسپوں پر دائیں طرف سے۔ نواب محمد ظہیر الدین صاحب سابق صدر بزم۔ مولوی عبدالقادر صاحب بوری ناظم بزم۔
ڈاکٹر سید محمد الدین صاحب قادی زور ناظم بزم۔ میر سعادت علی صاحب ضوی بلی۔ اسے صدر بزم۔
عائین بابت مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب صدر کلید۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین صاحب ناظم بزم
محمد مخدوم محی الدین صاحب مقرر بزم۔ عزیز احمد صاحب سابق صدر بزم۔
استادہ صفوں میں۔ میران بزم اردو

۲۲-۱۳۳۳ (ف)

بزم آرد و



فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نگار	مضمون	نمبر شمار
۵	یہ	تہبید	۱
۹	غلام محمد خاں صاحب بی۔ اے عثمانیہ متعلم سال ششم	حیرسن کے استاد	۲
۱۷	عزیز احمد صاحب بی۔ اے متعلم سال خپسیم	اقبال کی شاعری حیرسن و عشق کا عنصر	۳
۳۰	غفور احمد صاحب مجذوی متعلم سال سوم	یری انشا پر وازی	۴
۳۲	محسن بن شبیر صاحب بی۔ اے متعلم ال ال بی	شاعری و افلاس	۵
۴۴	حیرسن صاحب بی۔ اے متعلم سال ششم	ملن اور تفتیش	۶
۵۵	مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے عثمانیہ معتد بزم اردو	راہبند رانا محمد بیگور کی ادبی زندگی کا آغاز	۷
۶۱	نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر بی۔ اے (عثمانیہ)	نواب س ل امرا بہادر کے علمی کارنامے	۸
۶۹	مخدوم محی الدین صاحب بی اے معتد بزم اردو	مفلس (نظم)	۹
۷۱	مخدوم محی الدین صاحب بی اے معتد بزم اردو	طور	۱۰
۷۳	سکندر علی صاحب وجد متعلم بی۔ اے عثمانیہ	وجدانیات	۱۱
۷۴	سکندر علی صاحب وجد متعلم بی۔ اے عثمانیہ	وجدانیات	۱۲

صفحہ	مضمون شمار	مضمون	نمبر شمار
۷۵	محمد عبدالحمید خاں صاحب شارق متعلم سال چہارم	یادِ ایام (نظم)	۱۳
۷۷	میر سعادت علی رضوی بی۔ اے صدر بزم اردو	میں	۱۴
۷۸	میر سعادت علی رضوی بی۔ اے صدر بزم اردو	پردانگی زبان سے	۱۵
۸۱	ابو انجیر سید ابراہیم حسینی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)	بزم اردو کی ادبی جدوجہد	۱۶
۸۷	میر سعادت علی رضوی بی۔ اے صدر بزم اردو	خطبہ صدارت	۱۷
۸۹	مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے معتمد بزم اردو	رپورٹ بزم اردو باب۲۲ و ۲۳ ف	۱۸



تہذیب

(از)

میر سعادت علی رضوی (بی۔ اے) صدر بزم ودیر سالنامہ بزم اردو کلکتہ جامعہ عثمانیہ

بزم اردو اور آرا بان سرف میں قائم ہوئی۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی کچھ دنوں کے لئے اس بزم کا قیام ہوا تھا مگر اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا جامعہ عثمانیہ کے لئے جو خاص ادب اردو کی ترقی کی ذمہ دار ہے ایک ایسی بزم کی ضرورت تھی جو اردو کا ذوق رکھنے والے طلبہ کی ادبی دلچسپیوں میں اضافہ کرے۔

بزم کا افتتاحی جلسہ شاندار پیمانہ پر ہوا جس میں علاوہ اساتذہ اور طلباء کے کالج کے حیدر آباد کے اکثر معزز عہدہ دار اور ادیب بھی شریک تھے۔ اس سال کے منتخب صدر نواب ظہیر الدین خاں صاحب فرزند نواب معین الدولہ بہادر اور معتد ابو الخیر سید ابراہیم حسینی صاحب کی کوششوں سے چھ معمولی جلسے مقرر کئے گئے جن میں پانچ مباحثے ہوئے اور ایک مقالہ پڑھا گیا تین غیر معمولی جلسے ہوئے جن میں مولوی سعادت صاحب صدر شعبہ اردو کلکتہ جامعہ عثمانیہ اور مولوی مرزا فرحت بیگ صاحب دہلوی نے ” اردو کے طالب علموں کی ضروریات “ اور ” اردو مضمون نگاری “ پر معینہ اور پر از مسلمات تقریریں فرمائیں ایک مشاعرہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی مرحوم کی برصدرات منعقد کیا گیا جو نہایت کامیاب رہا۔

اس کے علاوہ اس سال کا ایک نمایاں کارنامہ ”بین اٹلیاتی فی البدیہہ تحریری مقابلہ“ تھا جس میں جامعہ عثمانیہ کے علاوہ نظام کالج اورنگ آباد کالج اور زناہ کالج ماہلی کے طلبہ اور طاباۃ نے بھی حصہ لیا۔ بہترین مضمون کے لئے صدر بزم نواب ظہیر الدین خاں صاحب نے ایک رولنگ کپ عنایت فرمایا جو عزیز احمد صاحب طالب علم کلید جامعہ عثمانیہ نے حاصل کیا۔ دوم اور سوم آنے والوں کو بھی نفلکے بزم کی طرف سے کتابیں انعام میں دی گئیں بزم کی جانب سے ایک ڈرامہ کالج کے دن“ مسند عزیز احمد صاحب یوم کلید کے موقع پر اسٹیج کیا گیا جو نہایت کامیاب رہا۔ دوسرے سال یعنی ۱۹۲۱ء فصلی کے منتخب صدر عزیز احمد صاحب و مستند زاہد علی صاحب کامل نے چار مباحثے اور تین غیر معمولی جلسے منعقد کئے۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر اردو نے ”اردو کے اولین قصے“ کے عنوان پر ایک پرمغز مقالہ لکھا جس میں اردو کے قصوں کی ابتدا ارتقا اور زوال پر تحقیقی معلومات پیش کیں۔ ڈاکٹر جعفر حسین صاحب پروفیسر عمرانیات نے ”ہندی شاعری“ پر ایک عالمانہ مقالہ پڑھا جس میں ہندی کی اہمیت اور سلماں بادشاہوں نے جو خدمات کیں ان کو تفصیلاً بیان کیا۔

علامہ علی حیدر صاحب طباطبائی مرحوم نے ”یٹا برج کے سنج سیارہ“ پر ایک تقریر فرمائی۔ بزم اردو کو فخر ہے کہ علامہ مرحوم کی آخری اور اہم تقریر استعد رکب سنی میاں سی کے زیر سرپرستی منعقد ہوئی۔

بزم کی علمی مشغولیتوں میں ایک اور شاندار اضافہ جو اس سال ظہور میں آیا وہ ”بین اٹلیاتی تقریری مقابلہ“ تھا جس میں اول آنے والے طالب علم علی اطہر صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ کو ایک رولنگ کپ راقم نے پیش کیا۔ اس سال ۱۹۲۱ء راقم صدر اور محمد موم علی الدین صاحب مستند منتخب ہوئے ہم نے صرف دو مباحثے اور ایک غیر معمولی جلسہ منعقد کیا جس میں عزیز احمد صاحب سابق صدر نے ”روسی ٹھیسٹہ“ پر ایک تحقیقی مقالہ پڑھا۔

تعلیمی تفریح اور ایک ادبی رسالہ کا اجراء و سال سے پیش نظر تھا۔ اس سال ہم نے ان دونوں کو عملی جامہ پہنایا۔ سائنس طلبہ کی ایک جماعت نے زیر نگرانی ڈاکٹر ذور صاحب مولوی عبدالقادر صاحب سروری قلعہ گوکنڈہ اور سلطان صاحب کی گنبدوں کا تفصیلی مسائنہ کیا۔ محترم اساتذہ نے ہر جگہ بادشاہوں کے حالات ان کی ادبی دلچسپی اور تصانیف پر مختصر تقریریں کیں اور اس میدان میں ہمارا یہ پہلا قدم نہایت کامیاب رہا۔ رسالہ جو اس وقت ناظرین کے زیر مطالعہ ہے۔ آپ اپنی خوبیوں کا شاہد ہے۔ جس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں البتہ اس کا ادبی میاں خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ ہمارے

سالنامہ بزم اردو
 ارکین کی ادبی مصروفیتیں جو اب تک منظر عام پر نہ آئی تھیں ان کے شنف اور بزم کی کامیابی پر روشنی ڈالنے کے لئے بہت
 کافی ہے۔

اس سال نامے میں بعض مضامین ارکین کی ان کتابوں سے لئے گئے ہیں جو بزرگ صبیح یازیر مرتب ہیں مثلاً "میر حسن
 استاد" جو علام محمد خاں صاحب کی کتاب "وروی شاعری" سے لیا گیا ہے۔ "ملین اور نقشب" جو میر حسن صاحب کی "سایخ
 ادب انگریزی" کا ایک جزو ہے اور "ٹیگور" جو محمد و محی الدین صاحب کی کتاب "ٹیگور" سے ماخوذ ہے۔ ان مضامین
 کے مطالعہ سے اس کتابوں کی اہمیت ناظرین پر واضح ہو جائے گی۔ بقیہ مضامین سے جو خاص ہی سالنامہ کے لئے لکھے
 گئے ہیں ارکین کی تحقیقی و تنقیدی ذوق کا پتہ ملتا ہے۔ عزیز احمد صاحب نے ہندستان کے مشہور قومی شاعر کے اردو کلام پر
 ایک نئے پہلو سے نظر ڈال کر ایک فاضلہ تنقید کے ساتھ اپنے وسیع معلومات کا ثبوت دیا ہے اور نواب ظہیر الدین خاں صاحب
 کا مضمون "شمس الامراء" اردو دان طبقہ کو اس سلسلے سے روشناس کرا رہا ہے جو اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔
 بزم نواب صاحب کے اس ادبی ذوق کی مشکور ہے۔ محسن بن شمیر صاحب نے بھی ایک انوکھے عنوان پر قلم اٹھایا ہے جو اب تک
 اچھوتا تھا اور کافی معلومات ہم پہنچائی ہیں۔

ہمارے ارکین جس طرح نثر کے میدان میں تیز قدمی دکھا رہے ہیں اسی طرح گلشن نظم کی آبیاری میں بھی کافی
 حصہ لیتے ہیں چنانچہ اسی سالنامہ کی نظمیں ان کی شعری استعداد کا ثبوت دیتی ہیں۔

ان تمام مصروفیتوں میں ہمارے ہمدرد استاد مذہب مولوی عبدالحق صاحب صدر شہید اردو۔ ڈاکٹر سید محی الدین
 صاحب قادری زور اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے جو وقتاً فوقتاً ہماری رہنمائی اور مدد فرمائی ہے اس کی
 سپاس گزاری ناممکن ہے۔ حق یہ ہے کہ بغیر ان حضرات کے مفید مشوروں کے ہم اپنے مقاصد میں اس قدر کامیاب نہ ہوتے۔
 عالیجناب مولوی عبدالرحمن خاں صاحب صدر کلید جامعہ عثمانیہ کی ہر مہربانیوں کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہے جنہوں نے
 باوجود عظیم الفرصتی کے ہمارے تمام کاروبار میں ہمیشہ دلچسپی لی اور بہت افزائی فرماتے رہے۔ آخر میں میں اپنے ان کرم فرما
 دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے سالنامہ کے اجراء میں ہلکا ہاتھ بٹایا اور اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اس کو کامیاب بنایا فقط

میر حسن کے استاد

(از)

غلام محمد خان عثمانی۔ ۱۷ شمانیہ متعلم ام۔ ۱۷ (آخری) اہتم مدیر جگہ عثمانیہ

میر حسن کا اصل نام میر غلام حسن اور تخلص حسن ہے۔ لیکن وہ اب تک اپنے پورے نام سے اور نہ ہی تخلص مشہور ہوئے بلکہ میر حسن کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ دلی میں پیدا ہوئے اور ایک بڑے عرصہ تک وہیں بود و باش کی۔ والد کا نام میر غلام حسین تھا اور ضاحک تخلص کرتے تھے تخلص انکو مناسب حال تھا اس لئے کہ غلام حسین بہت ہی ہشاش بشاش اور ہنسور واقع ہوئے تھے چونکہ عربی میں ضاحک کے معنی بہت ہنسنے والے کے ہیں شاید اسی مناسبت سے غلام حسین نے ضاحک تخلص اختیار کیا۔

میر حسن پرانی دلی محلہ سیدواڑہ سنگلہ میں پیدا ہوئے۔ خود باپ نے ان کی تربیت کی اور فارسی زبان کی تعلیم دی۔ میر حسن صرف اردو فارسی کے ماہر اور عربی سے بالکل ناواقف تھے۔ شاعری ان کا آبائی پیشہ تھا اس لئے خود بخود یہ میراث ان کے ورثہ میں آگئی۔ ابھی وہ بچے ہی تھے کہ ان کی ٹوٹی چوٹی زبان سے چیدہ چیدہ مصرعے ٹیک پڑے باپ کو بڑی خوشی ہوئی۔ بیٹے کی خاص طور پر نگرانی کرنے لگے جب تھوڑا بہت ہوش آ گیا تو اچھے اچھے شعر کہنے لگے۔ چار پانچ شعر کی جوں ہی ایک غزل موزوں کی والد بزرگوار کے پاس اصلاح کی غرض سے لیکر بیچتے

چونکہ میر حسن ایک فطری شاعر تھے ان کی طبیعت شاعری کے لئے ہمایوت موزوں تھی اور یہ کہ وہ محض آمد کے بل پر شعر کہتے تھے اس بخاند سے ان کے اشعار میں بہت کم اصلاح و درستی کی ضرورت پیش آتی تھی۔

میر حسن کا ابھی عنفوانِ شباب ہی تھا کہ ملی پر تباہی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اکثر خاندان پریشان حال ہو کر لکھنؤ اور دوسرے مقامات کو سدھارے۔ اسی مرحلہ میں میر ضاحک نے بھی لکھنؤ کی راہ لی اور میر حسن بھی اپنے والد کے ساتھ ہوئے پہلے فیض آباد پہنچے یہاں کچھ عرصہ رہ کر لکھنؤ چلے گئے۔

میر حسن کی شاعری کے بارے میں کچھ اختلافات ہیں۔ یہ امر تو مسلم ہے کہ پہلے پہلے وہ خود اپنے والد ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ لکھنؤ جانے کے بعد انھوں نے میر ضیاء الدین ضیا نامی استاد کی شاگردی اختیار کی لیکن ان کا رنگ پسند نہ آیا شاید کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ تلمذ جاتا رہا۔ اپنی شاگردی کے بارے میں خود انھوں نے اپنے تذکرہ شعر کے اردو میں کچھ لکھا ہے ہم اس کو یہاں بعینہ نقل کئے دیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:۔ ”نیر آسمان سیادت و گوہر بحر شرافت و کائے وے کمال ضیاء و بہائے او در نہایت بہا المتخلص بہ ضیاء بد رسیت از سپہ کمال و صدر رسیت ز مجلس جلال..... اکثر شاعران آن دیار اصلاح سخن از میر موصوف میگردد۔ بندہ ہم استفادہ سخن از ان بزرگوار نمودہ۔ استاد فقیر مولف کتاب ہمان است۔ لیکن در وے متعلق کھتے ہیں اکثر فقیر در خدمت آن بزرگوار میر سد بسیار کرم میفرماید“ مگر یہ نہیں لکھا کہ اصلاح وغیرہ بھی لی ہے۔

میر حسن نے اپنا تذکرہ نواب وزیر اودھ آصف الدولہ کے ذریعہ حکمرانی سلطنت مطابقت سے لکھا ہے۔ تالیف کیا۔ جبکہ ان کی عمر تقریباً پچاس سال کی تھی۔ اس وقت تک وہ ایک پختہ کار اور مشہور شاعر بن گئے تھے لہذا پچاس پچپن برس کی عمر میں ان سے شاگردی کی کسی طرح توقع نہیں کی جاسکتی۔ اچھا تا اگر ایسا ہی ہوتا یعنی پچاس برس کی عمر میں بھی میر موصوف نے کسی کی شاگردی کی ہوتی تو وہ میر ضیاء کی طرح اپنے دوسرے استاد کا بھی ذکر کر دیتے یا اس سے پہلے انھوں نے جس کسی کو اپنا کلام دکھایا تھا اس کا نام ظاہر کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے اکثر تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ میر حسن اول اول درد سے اصلاح لیتے تھے اور اوائل عمر میں سود کو بھی اپنا کام دکھایا ہے۔

ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ جب میر حسن دلی سے لکھنؤ چلے آئے تو بالکل نوجوان تھے ایک بار لکھنؤ جانے کے بعد پھر کبھی انہیں دلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ اگر انہوں نے درد کی شاگردی کی تھی اور انہیں اپنا کلام اصلاح کی غرض سے لکھا یا تھا تو ان کا اولین یہ اخلاقی فرض تھا کہ تذکرہ میں میر ضیا کے ذکر سے پہلے یا کم از کم بعد ہی اپنے سب سے پہلے محسن و استاد یعنی خواجہ میر درد کا نام نامی لکھ کر اس پر نغز کرتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارے میں خود یہ نام نہاد شاگرد خاموش ہے۔ مگر ان کی تحریر سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ میر درد کے ساتھ ان کے تعلقات بہت اچھے تھے اور یہ اکثر درد کے گھر جایا کرتے تھے چونکہ ان کو درد کے کلام کا رنگ مرغوب تھا اس لئے اس سے محظوظ نظر ہوتے اور خود بھی اسی قسم کا کلام کہنے کی کوشش کرتے لیکن اس بات کا کہیں سراغ تک نہیں ملتا کہ آیا وہ درد سے مشورہ سخن بھی کرتے تھے یا نہیں۔ اس میں شک نہیں میر حسن درد کے بڑے مداح ہیں جمی کھو لکر ان کی تعریف کی ہے لیکن کسی جگہ بھی استاد ی اور شاگردی کا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ درد کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "سائلک مسالک مکاشفات دینی و نایب مناجح مجاہدات یقینی از عرفائے عالی مقام و فقہائے ذوی الاحترام بر آسمان سخن مانند خورشید فرد حضرت خواجہ میر المخلص بہ درد از عالمان خوش ذات و از درویشان نیکو صفات طنطنہ فضل و کمال و دبدبہ جاہ و جلال اوبلنک رسیدہ و ملناب خمیدہ فکر عالیشان چون شعاع ہزار مشرق تا مغرب کشیدہ در بحر فیض ہمہ گوہر تا سفتہ و بے گشتہ او عقل آفرینہا گشتہ مرشد بود آدمی حقیقت و رہبر میدان شریعت دل آگاہ و سہ فحوز ان اسرار ندائی معنائی باطنش محرم کعبہ کبریائی خسر و اقلیم حال و قال جامع صفات جلال و جمال شاعر فارسی و ہندی نے غلطی میں چہ لائق ادست بل شعر گفتن دون مرقبہ ادست دیوانہ اگرچہ مختصر است لیکن چون کلام حافظ سراپا انتخاب دام افضال۔"

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ میر حسن درد کے حالات سے کس حد تک واقف تھے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ درد کے بہت بڑے مُتقد بھی تھے جن کی بزرگی و عظمت کا سکہ میر حسن کے دل پر جا ہوا تھا۔ مگر کہیں اس چیز کا پتہ نہیں چلتا کہ کسی وقت انہوں نے درد کو کوئی غزل بھی دکھائی یا کبھی اصلاح لی یا یہ کہ مشورہ سخن کیا ہے۔ اگر واقعی میر حسن درد سے فیض سخن حاصل کرتے تو میں نہیں سمجھتا کہ انہیں اس کے اظہار میں کوئی امر مانع تھا۔ اگرچہ

اس وقت داؤد میرا میر وہ ہے جس کو ممکنہ طور پر بڑھا بنا چڑھا نا اور اس کی شہرت و مقبولیت، نیز اس کی عظمت و بزرگی، علم و فضل اور پایۂ استاد کی کو عرشِ معلیٰ سے بھی بڑھا دینا مشرقی سوانح نگاری کے لوازمات سے ہے لیکن ہمارے ہیرو کی ذہانت و الاصفات اس قسم کی ظاہری اور نمائشی شہرت سے بے نیاز ہے۔ خود اس کا کلام فصاحت الہیام اور معجز بیان اس کے نام نامی کی شہرت و مقبولیت کو چار چاند لگانے کے لئے کافی ہے۔ میر حسن اس میں کوئی کلام نہیں آد اردو کا اعلیٰ پایہ مقبول عام اور مشہور شاعر ہے حقیقت میں جس کی شاگردی کے توسل سے اس کے استاد کی شہرت اور مرتبہ میں ایک غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ زبردستی کبھی کسی کو شاگرد بنا دیں۔ اسی طرح اردو اور فارسی کے تذکرہ نویسوں کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ میر حسن نے آخر عمر میں سودا سے جبکہ وہ دلی سے فیض آباد گئے اصلاح لی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں اس کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر میر حسن کو سودا کی شاگردی کا بھی شرف حاصل ہوتا تو میر ضیاء کی طرح اپنے تذکرہ میں ان کا بھی ذکر کرتے۔ اس لئے کہ میر حسن نے سودا کے فیض آباد پہنچنے کے چھ سال بعد اپنا تذکرہ تالیف کیا ہے یعنی ۱۳۱۸ھ میں سودا لکھنؤ گئے اور ۱۳۱۹ھ میں میر حسن نے تذکرہ لکھا۔ مگر تذکرہ میں سودا کی شاگردی کے تعلق کوئی اشارہ تک نہیں دیا۔ ان وجوہات کی بنا پر ہم خواہ مخواہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میر حسن نے سودا سے بھی مشورہ سہن کیا ہے۔ سودا کا حال بگھتے ہوئے وہ اس طرح تعریف کرتے ہیں "استاد استاد کمال و قادر میر آ مد شعرائے زمان در میدان نزاکت بیان فکوش چون ہر گرم است..... اکثر فقیر در خدمت آن بزرگوار میر سد بسا کر م میفرماید....."

اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ مذکورہ بالا عبارت کا کیا مفہوم ہے اور کس جمل یا لفظ سے یہ بات ثابت ہوتا

ہے کہ میر حسن سودا سے اصلاح لیتے تھے۔

ذیل میں ہم ان مختلف تذکرہ نویسوں کی رائے درج کرتے ہیں جنہوں نے میر حسن کی شاگردی کی تشریح

کی ہے :-

ان کے ہم عصر شعراء میں میر تقی میر نے نکات اشعار میں لکھا ہے "مشق سخن از مرزا رفیع می کند" جو بالکل غلط ہے

آگے چل کر لکھتے ہیں "با فقیر نیز آشناست لا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آشنائی برائے نام تھی۔ میر صاحب میر حسن کے حالات سے مطلق

آگاہ نہیں تھے یونہی سن سنا کر لکھ دیا ہوگا۔

آبِ حیات میں آزاد لکھتے ہیں کہ جب تک دلی میں رہے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے۔
ادوہ میں جا کر میر ضیاء الدین ضیاء کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی، ابوالقاسم حکیم میر قدرت اللہ
قاسم نے مہمؤغز میں لکھا ہے ”شاگرد میر ضیاء الدین ضیاء است و از خدمت سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع
سودا ہم استفادہ نمودہ“۔

موازنہ نہیں وہ دبیر میں شہلی نے لکھا ہے کہ ”میرسن صاحب غزل گوئی میں اگرچہ سودا اور میر درد کے شاگرد تھے
لیکن سودا کا پر تو لحن پر نہیں پڑا صرف میر درد کا رنگ ہے“ اس میں شک نہیں کہ میرسن کی غزلوں میں درد کا رنگ
نمایاں ہے لیکن اس کے یہی نہیں ہو سکتے کہ انھوں نے شاگردی کی تھی جو یہ رنگ پیدا کیا بلکہ اس کے اسباب کچھ اور
ہی تھے جو بعد میں بیان ہوں گے۔

سیکسنہ نے تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ بچپن میں درسی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی اور کلام بھی نہیں
کو دکھایا۔ اس کے بعد خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے ”مؤلف مذکور نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ”میرسن میر ضیاء کے رسمی طور پر
شاگرد تھے“ حالانکہ یہ امر بالکل خلاف واقعہ ہے۔ میرسن میر ضیاء کے حقیقی معنی میں شاگرد تھے مگر چونکہ اپنے استاد کی طرف
پسند نہ آئی اس لئے دوسروں کی پیروی کی نہ کہ شاگردی۔ مذکورہ بالا تذکرہ نویسوں کے علاوہ اور دوسرے تذکرہ نویس
بھی نہیں درد اور سودا کا شاگرد بتاتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو صرف میر ضیاء ہی کی استادی کا حوالہ دیتے ہیں۔
مثلاً مصحفی رقمطراز ہے ”و شعر خود از نظر میر ضیاء الدین ضیاء میگذرانید“ مصحفی وہ شخص ہے جو اکثر درد سے
بھی ملاحظہ کرتا تھا چنانچہ لکھا ہے ”اکثر فقیر در خدمت آن بزرگ بے غرضانہ میرود“ اور میرسن سے بھی اس کی خاطر ملاقات
تھی۔ میر و سودا سے بھی ایسے تعلقات رکھتا تھا اس صورت میں اگر میرسن کو درد اور سودا سے بھی ملنا کا شرف حاصل
ہوتا تو میرسن نہ سہی مصحفی تو اپنے تذکرہ میں اس کا اشارہ کر دیتا۔ مؤلف گلشن بے غار مصطفیٰ خاں شیعہ کا بھی اسی پرانہ
ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں ”از تلامذہ میر ضیاء است“ میر قدرت اللہ شوق نے بلقعات الشعرا میں لکھا ہے کہ ”از شاگردان
رشید میر ضیاء است“ صاحب گلشن ہند مرزا علی لطف لکھتے ہیں ”اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیاء سے لی ہے“

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ میر حسن کو اپنے استاد ضیاء کی طرز پسند نہ آئی اس لئے انہوں نے بقول مصحفی بحکم توت

میزہ قدم پر جاؤ متیقم اساتذہ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا فیح سودا و میر تقی میر گزاشتہ کلام خود بر حسبہ پاکیزگی و شستگی رسانید مصحفی کی اس تحریر سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ میر حسن ان تینوں استادان وقت کے کلام سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں خود بھی رنگے جانے کی کوشش کرنے لگے چنانچہ خود انہوں نے لکھا ہے کہ اصلاح سخن از میر ضیاء سلمہ گرفتہ ام

لیکن طرز اوشان از من کما حقہ سر انجام نیافت بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد و مرزا فیح سودا و میر تقی میر پیروی نمودم اس آخری جملہ پیروی نمودم سے اکثر حضرات کو دوہو کا ہو گیا۔ انہوں نے پیروی نمودن کے غلط معنی لئے اور اس سہو کے تحت میر حسن کو درد و سودا کا شاگرد بنا دیا۔ پیروی کرنا اور اصلاح لینا دو بالکل جداگانہ چیزیں ہیں۔ اگر کوئی شخص دلی میں

رہ کر کسی مشہور و کئی شاعر کے کلام کی متبع کرے تو اس پر شاگردی کا اطلاق نہیں آسکتا یہی حال بالکل میر حسن کا بھی تھا۔ وہ ہر استاد کے کلام کا مطالعہ کرتے اُس سے لطف اٹھاتے اور خود بھی اس انداز میں کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ مذکورہ شعراء میں بھی نہیں صرف میر درد کا رنگ زیادہ پسند تھا اور وہ زیادہ تر اس طرز میں کہنے کی کوشش کرتے تھے ہی وجہ ہے کہ ان کے کلام

میں درد کے رنگ کی جھلک بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس لئے جلتے رنگ نے مذکورہ نویسوں کے مخالف کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ شاید انہی وجوہ کی بنا پر ناصر زید فراق نے میخانہ درد میں میر حسن کو درد کا شاگرد بتاتے ہوئے صنف اول میں جگہ دی ہے۔ مذکورہ بالا دلائل و براہین پر غور کرنے کے بعد ایک منصف مزاج شخص اس نتیجے پر پہنچے گا کہ میر حسن درد ہی کے شاگرد تھے اور نہ

سودا کے بلکہ اپنے والد سے اصلاح لی اور پھر لکھنؤ جا کر میر ضیاء کی شاگردی کی یہی وجہ ہے کہ ہم ان کا نام نامی درد کے شاگردوں کی فہرست میں شریک کرنے سے مجبور ہیں۔

احمال دلی کی تباہی کے بعد جب سب شاعر عروس ابلاد سے کوچ کر چکے تو میر حسن نے بھی اپنے والد کے ہمراہ دیگ

کی راہ لی یہاں سے مکھن پور ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے جہاں نواب سالار جنگ کے زمرہ ملازمین میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں

نواب مدوح کے فرزند نواب میر نوازش علی خاں بہادر کے عرصہ دراز تک مصاحب رہے جب نواب آصف الدولہ سربراہ کے

سلطنت ہوئے تو انہوں نے ۱۷۵۵ء میں بجائے فیض آباد کے لکھنؤ کو پایہ تخت قرار دیا سلطنت کے منتقل ہوتے ہی فیض آباد کے

جلاہل کمال لکھنؤ چلے گئے اسی مرحلہ میں میر حسن کو بھی جانا پڑا۔ لکھنؤ آنے کے بعد میر حسن کے اقبال کا ستارہ اور بھی چمک اٹھا۔

میر حسن کی تصنیفات میں ریختہ کا ایک ضخیم دیوان ہے جس میں ہر صنف شعر پر مناسب انداز میں طبع آزمائی کی گئی ہے جو اس دیوان میں تقریباً سات ہزار شعر ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی ایک سنجوں بھی کہی ہیں جن میں نقل کلاؤنٹ سنجو کا ہجو عظیم کشمیری اور ہجو قصاب وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ شعر اردو کا ایک تذکرہ بہ زبان فارسی ۱۹۲۲ء میں لکھا ہے۔

اردو ادب کی دنیا میں میر حسن کا نام محض ثنویوں کے باعث اور نہیں بھی سحرالبیان کے سبب زندہ اور مشہور ہے یوں تو میر موصوف نے چھوٹی بڑی کئی ایک ثنویاں لکھی ہیں مگر ان میں صرف تین ثنویاں زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی سب سے پہلی مثنوی رموز العارفین ہے جو ۱۹۱۱ء میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کا نام خود اس کے موضوع کو ظاہر کرتا ہے کہ اس میں تصوف عرفان کے مسائل ہیں۔ چونکہ میر حسن پہلے پہلے مذہبی پیشواؤں کی صحبت میں زیادہ تر رہتے تھے اس لئے ان پر یہ رنگ غالب تھا اور خواجہ میر درد کی صحبت کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا تھا۔ اس مثنوی کا موضوع اور طرز بیان مولوی روم کے کلام سے بہت کچھ لٹا جلتا ہے۔

ان کی دوسری مشہور مثنوی ”گلزارِ ارم“ ہے۔ اس مثنوی کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۹۲۱ء کے عدو حال ہوتے ہیں یعنی ۱۹۲۱ء کی تصنیف ہے اس مثنوی کے لکھنے سے میر حسن کا اہل مقصد فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو کرنا تھا۔ مگر ضمناً بہت سی چیزیں آگئی ہیں مثلاً اس کے مطالعے سے ہیں اس وقت کے لکھنؤ اور فیض آباد کی طرز معاشرت اور تمدن رسم و رواج، لباس وغیرہ کے متعلق بہت سی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود شاعر کے حالات کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے اور اس کے سفر پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

سحرالبیان یہ میر حسن کی آخری تصنیف ہے جو ۱۹۱۱ء کے ختم پر لکھی گئی۔ یہ وہ مشہور عالم مثنوی ہے جس کے باعث میر حسن

۱۵۔ قتیل نے اس مثنوی کا سنہ تصنیف اسی طرح تحریر کیا ہے (سجواً تذکرہ سدا سکھ دہلوی)

یہ تفتیش تاریخ این مثنوی کہ گفتش حسن شاعر دہلوی

ز دم غوطہ در بحر فکر رسا کہ آرم بہ کف گوہر مدعا

یہ گو شمش زہا کف رسید این ندا بر این مثنوی باد ہر دل ندا

(مجموعہ تحقیقات علمیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ جلد اول ۱۹۱۱ء "میر حسن" از ڈاکٹر سعید محمد الدین قادری زور ام۔ ۱۔ ۷۱۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ۲)

حقیقی معنی میں میر حسن بنے۔ اس مثنوی کا موضوع زراعتیہ ہے۔ بدتر سیر اور بے نظیر کے مثنوی کی ایک خیالی داستان ہے مثنوی ہر شہار سے غیر معمولی سائنس کی سستی ہے۔ اس مثنوی کے متعلق اس کے سنہ تصنیف سے آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کا طرز میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس کی تعریف کے پہلے باندہ کر خواہ مخواہ بھی اپنے موضوع کو طول دوں اس کی تعریف میں میر حسن کا مصنف مشہور شاعر معنی اپنے تذکرہ شعرائے اردو میں یوں طب الالبان ہے ”خصوصاً مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد ید بفضیائے نمودہ۔ الحق کار کارادست۔ قطع نظر از بلاغت شاعری ز بانہ بسیار با مزہ و شیرین و عالم پند افتادہ“ سحر البیان کے متعلق میخانہ ورد کے مصنف ناصر میرزاق کا خیال ہے کہ اس میں جا بجا خواجہ میر درد نے اصلاح دی ہے جو مصرعیا غلط سے اس لئے کہ جس سنہ میں خواجہ صاحب کادلی میں انتقال ہوا اسی سنہ کے آخر میں یہ مثنوی لکھی گئی جس کے صلہ میں نواب ادوہ نے شاعر کو ایک زرین دو شاہ عطا فرمایا تھا۔

بالآخر عرصہ تک بیمار رہ کر مشرہ محرم لکھنؤ میں انتقال کیا۔ مصحفی نے تاریخ کہی۔

چون حسن آن بسبب خوش داستان اوازین گلزار رنگ و بوبتافت

بسکہ شیرین بود لطفش معصی شاعر شیرین زبان تاریخ یافت

مفتی گنج میں مرزا قاسم علی خاں کے باغ کے پھوپھوڑے دفن کئے گئے۔

۱۔ لیکن فیہا بجا البیان کے مصنف سد اسکھ دہلوی نے لکھا ہے کہ..... میر حسن در تمام عمر خود مثنوی کہ زیادہ از دو ہزار با قصد

نہ خواجہ صرف کرد۔ مرزا آسبل بسیار اصلاح دادہ.....“

اقبال کی شاعری

حس و عشق کا عنصر

(۱)

عزیز احمد صاحب بی۔ اے۔ بتعلم سال پنجم

جسٹوکل کی لے پھرتی ہے اجزا، میں مجھے
حس بے پایاں ہے درو لاوار کھتا ہوں
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا جو جس سو خوش
آہ وہ کابل تجلی مدعا رکھتا ہوں میں
فیض ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب
تشنہ دائم ہوں آتش زیر پار کھتا ہوں میں
مخمل ہستی میں جب ایسا تک جلوہ تھا حسن
پتھر کس لئے لا آتہا رکھتا ہوں میں (اقبال)

(۱)

نفسیاتی رجحانات

حس سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہر انسان میں کم و بیش موجود ہے اور اسی طرح حس میں محو ہو جانے، حس کی طرف کھینچ جانے یا حس کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت بھی انسانی فطرت کا ایک عنصر ہے۔
شاعر میں یہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جذبات اس قدر عمیق اور اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ جب ان میں اُبال آتا ہے تو وہ اُس کی ذات میں سما نہیں سکتے اور الفاظ اور نغمے بن کر اُبل پڑتے ہیں۔

عشق شاعر کے جذبوں پر چھا جاتا ہے اور جذبوں میں ایک پیش ایک جوش ایک بے تابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بے تابی عشق ہے۔ اور جب یہ بے تابی اُس کے قلب کی لطافتوں اور اُس کے دماغ اور ادراک کی مدد سے الفاظ و معانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو شعر بن جاتی ہے۔ اسی لئے اگر عشقیہ شاعری کی صحیح تعریف کی کوشش کی جائے تو صرف انہی الفاظ میں اُس کی تعریف کی جاسکے گی کہ وہ ایک انسان کے لطیف احساسات اور بے چین جذبات کا عکس ہے اگر عکس بے ساختہ پڑے۔ تو شاعری حقیقی اور سچی ہے۔ اور اگر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے۔ یا کوئی اور مصنوعی دکھائی پیدا کی جائے تو عکس لاکھ خوبصورت ہو اُس میں وہ فطری حقیقت باقی نہیں رہے گی جس طرح عشق ایک اضطراری جذبہ ہے اسی طرح عشقیہ شاعری میں بھی اضطرار کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اور یہی اضطرار شاعر میں کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ شعر ”متحرک“ ہو جاتا ہے۔

۱۹۱۰ عشقیہ شاعری دل کی شاعری ہے اور اقبال دل سے زیادہ دماغ کے شاعر ہیں۔ عشق ان کے نزدیک ایک اضطراری چھا جانے والا محو کرنے والا جذبہ نہیں جس کا جادو نہیں اور ان کی پوری ہستی کو مسحور کر دے عشق اُن کے نزدیک ایک حقیقت ہے اور وہ اس حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں ان کے پوری کلام میں ایک نظم بھی ایسی نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جذبات کے افسوں سے اس قدر مسحور ہیں کہ فطرت اُن سے خود بخود لکھو اڑی ہے عشق اُن کی شاعری کا ”باعث“ نہیں ”مقصد“ ہے۔

”عشق“ کا جو تصور اقبال کے ذہن میں ہے وہ ایک مستقل اور عظیم الشان حقیقت کا ہے۔ اور اس حقیقت کی جستجو اس کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کی کوشش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کی ہستی اس حقیقت سے بالکل الگ ہے۔ کلیم دور سے طور کے شعلوں کو دیکھ رہا ہے اور ان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس تصور نے اقبال کے عشقیہ کلام میں دو خصوصیتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو یہ کہ عشق ہمیشہ ایک فلسفیانہ بحث بنتا گیا۔ دوسرے یہ کہ فطری لطافت، ”سادگی اور پرکاری“ اور نازک اور لطیف شعریت جو دل پر اثر کرنے والی شاعری کی جان ہے اُن کے عشقیہ کلام میں تقریباً مفقود ہے۔

اقبال شاعری کے لئے ہمیشہ ایک ”مقصد“ کو اپنا انتہائے نظر بنائے رہے۔ خود شعر کی ہیئت اُن کے

مفصلیں زیادہ نہیں تھی۔ اُن کا پیغام انفاذ کی طرح جذبات سے بھی ”ماورا“ رہا۔ اور ہر وہ شاعر جو پیغام لے کر آتا ہے محض جذبات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک قوم، ایک جماعت کے جذبات کا مہر ہوتا ہے۔ محض اس پیغام کے اثر سے اقبال کی عشقیہ شاعری میں ذاتی اور شخصی رنگ ہمیشہ پھیرا رہا۔ جہاں انہوں نے عشق کے جذبے سے اپنی ذاتی تاثر کا اظہار کیا ہے اُن کی شاعری پھلکی اور بے مزہ ہو گئی ہے لیکن جہاں انہوں نے عشق کا ایک بلند تر، پاکیزہ تر تصور ایک قوم کے لئے لائحہ عمل بنا کر پیش کیا ہے وہاں اُس میں ایک رفعت اور بلندی پیدا ہو گئی ہے۔

اسی شانِ دہبری نے عشق کو اُن کے نزدیک ایک تصور بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسا تصور جو ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم کی جذباتی اصرار و روحانی زندگی کو گراما کے۔

عشق اقبال پر چھا نہیں جاتا۔ وہ جُسن کو دیکھنے اور عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اُن کا زاویہ نظر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اُسے ایک پوری قوم کا زاویہ نظر بنا سکیں۔

(۲)

اقبال کے کلام میں حُسن و عشق کے عنصر کی نشوونما

اقبال کے مشقِ سخن کے زمانہ میں دلغ و امیر کا طولی ہندوستان میں بول رہا تھا۔ ”زبان“ کی خوبیوں کی طرف شرفیہوں اور شاعروں کی توجہ تھی۔ اور گویہ شاعری برائے نام عشقیہ شاعری تھی۔ مگر اسی کی وجہ سے عشقیہ شاعری کا صحیح مفہوم مٹ چکا تھا۔

”غزل“ جب اردو میں آئی تو تصنع بھی اُس کے ساتھ آیا۔ اور جہاں تصنع کا زور ہوا۔ جذبات کی صحت ختم ہو جاتی ہے۔ لفظی خوبیاں، جب شاعری کا اصول بن جاتی ہیں تو جذبات کے فطری اظہار کی شاعری میں صلاحیت نہیں رہتی۔ اردو شاعری سے شعری رُوح پر واز کر چکی تھی، مردہ جسم کی آرائش کی جا رہی تھی اور مصرعی می کی طرح، طرح طرح کے مسالے لگا کر اس جسم کو باقی رکھنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔

اس ماحول میں اقبال نے شاعری شروع کی۔ لیکن اسی ماحول کے ساتھ ساتھ ایک نیا ماحول بھی پیدا ہو گیا تھا۔

اور وہ سرسید اور حالی کا پیدا کیا ہوا ماحول تھا۔ مغربی شاعری کے اثرات بھی پڑنے لگے تھے۔

اقبال کی ابتدا انغزل گوئی میں داغ کارنگ بہت نمایاں ہے۔ داغ سے انہوں نے اصلاح بھی لی تھی اور داغ کے وہ بہت معترف تھے۔ داغ کے مرنے پر انہوں نے ایک نوحہ بھی لکھا۔ امیر کی شاعری کا بھی ان پر کافی اثر تھا۔ خود لکھتے ہیں۔

بے عیب شے ہے صنم خانہ امیر اقبال میں بت پرست ہوں رکھدی کہیں ہیں نے
اقبال کا تغزل بے رُوح اور بے رنگ تھا۔ ابتدا سے لیکر آخر تک کبھی انکی غزلیں حقیقت کا خیف سا اثر بھی پیدا نہ کر سکیں
کہیں ان میں لطفت اور سوز و گداز نہیں۔

بعد کی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات نے اور غزلیں نے جا بجا جذبات کے فقدان کی تلافی کی ہے۔ مگر عشقیہ رنگ کہیں نہ نہج سکا۔

لیکن وہ دوسرا ماحول جو اقبال کی شاعری پر اپنا اثر ڈال رہا تھا یعنی حالی اور سرسید کا ماحول بہت کامیابی سے اقبال کو اپنے آپ میں جذب کر سکا۔ وہ مغربی شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور ان کا اثر بھی ان پر پڑتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس بے رُوح تغزل اور اس حقیقت سے عاری شاعری کا ایک شدید ردِ عمل اقبال کی قومی، اخلاقی اور انغزلیوں میں ظاہر ہونے لگا جو انہوں نے مناظر قدرت یا قدرت کے اہم اجرام کو دیکھ کر یا ان سے مخاطب ہو کر لکھیں۔

اس زمانہ میں اقبال کے ذہنی ارتقا کے مطالعے کے سلسلے میں ایک بہت اہم چیز معلوم ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے جذبے کو ان کی فطرت سے جذباتی مناسبت سے زیادہ ذہنی مناسبت تھی۔ سب سے زیادہ جن مغربی شاعروں کا ان پر اثر ہوا وہ گوئے، وردسورتھ، شکسپیر اور گرے۔ تھے۔ ان میں سے کوئی خالص جذباتی شاعر نہ تھا۔ ہر ایک دل سے زیادہ دماغ کا شاعر تھا۔ اس اثر سے اقبال کی اس نفسیاتی کیفیت کا پتہ چلتا ہے کہ ان پر عشق جذبہ بن کر نہیں چھا سکتا تھا۔

فلسفے کے مطالعے نے جہاں اقبال کے تمام تر زاویہ ہائے نگاہ کو ایک مستقل اور مکمل حیثیت دیدی۔ وہاں

حُسن و عشق کے متعلق بھی ایک خاص نقطہ نظر کی تعمیر کی۔ فطرت ہی نے انہیں جذبات پرست طبیعت عطا نہیں کی تھی۔ فلسفے کے مطالعے سے جو ذہنی ارتقا ہوا اُس نے عشق اور حُسن کے مطالعے کو اُن کی شاعری میں بجائے جذبے کے ایک ”فکر“ بنا دیا اور جس طرح نیم فلسفیانہ اور نیم شاعرانہ فکر سے وہ زندگی کی اہم خصوصیتوں کو دیکھنے اور پرکھنے لگے، انہوں نے عشق کو بھی دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کی شاعری کا اہم ترین مقصد قومی شاعری تھی، عشق کے متعلق ان کا تصور تشکیلی بارا تھا لیکن ابھی یہ تصور ”پیغام“ نہیں بنا تھا۔ وطنیت اور قومیت اُن کے اہم ترین پیغام تھے۔ یورپ جانے کے بعد اُن کے نقطہ نظر میں بہت اہم تبدیلی ہونے لگی۔ وطنیت جو اُن کی شاعری کے پہلے کا پیغام تھا۔ اُن کو باطل نظر آنے لگا۔ اسلامیات کے مطالعے اور گونا گوں مختلف اور متضاد اثرات سے ایک نئے اہم پیغام نے اُن کی ہستی کو گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ پان اسلامی تحریک ان کو اس قدر متاثر کر گئی کہ وہ وطنیت کے جوش کو بھول گئے۔ اور یہ پان اسلامی تحریک جو مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر مشتمل تھی، اُن کی ہستی میں ایک اہم انقلاب پیدا کرنے لگی۔

یہ اُن کے قیام یورپ کا زمانہ تھا۔ وطنیت کے تخیل کو وہ باطل قرار دے چکے تھے۔ اور پان اسلامزم کا اثر مستقل اور مکمل طور پر چھانے نہیں پایا تھا اور اس زمانے میں جب کہ اُن کی ذات اُن کی ہستی میں نئی تعمیر ہو رہی تھی، ایک نئے تخیل اور نئے تفکر کی دنیا بن رہی تھی، اُن کی شاعری نسبتاً کم اہم اور ذاتی اور شخصی احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن سکی۔ اُن کی شاعری کا اصل مقصد یعنی اُن کا ”پیغام“ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اُن کی شاعری اس زمانے میں بڑی حد تک شخصی اور ذاتی شاعری بنی رہی۔ جا بجا انہوں نے جذبات نگاری کی کوشش کی۔ چند عشقیہ نظموں لکھیں۔ عشق کے متعلق نظموں لکھیں۔ ان میں سے کسی نظم میں درد و اثر یا حُسن و لطافت کی گرمی پیدا نہ ہو سکی۔

عشق کا مغربی اثر اُن کی شاعری پر پڑا۔ یہ اثر جو شخصی اور مجازی تھا کبھی تو مجازی جذبے کے شخصی اظہار کی صورت میں (مثلاً..... کی گود میں بی کو دیکھ کر) کبھی مغربی نظموں سے متاثر خیالات کی شکل میں (مثلاً ”حُسن اور زوال“) نمودار ہوا۔ یہ اثر محض ایک شاعر کی وقتی ”مشقوں“ سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن عشق کے متعلق جو نظموں

انھوں نے اس زمانہ میں لکھیں یعنی جن میں ذاتی تاثر زیادہ نمایاں نہیں۔ اور جن کی تحریر ”مقصد“ رکھتی ہے ان میں سے اکثر نظئیں باعتبار تخیل بہت بلند ہیں۔

پان اسلامزم کے اثرات جو اقبال کے ذہن پر چھا رہے تھے اور ان کی شاعری کا ذہب بن رہے تھے، اسی زمانے میں دو مختلف طریقتوں سے انکے کلام کے عشقیہ عنصر پر اثر انداز ہوئے ایک تو یہ کہ ان کے کلام میں مولانا روم کے اثر اور تصوف کے رنگ کی ابتدائی چائئیاں جا بجا پیدا ہونے لگیں۔ دوسرے یہ کہ عشق مجازی میں بھی مشرقی اور اسلامی جن کا تخیل اور تصور ایک روحانی میار بننے لگا۔ یہ تصور سب سے پہلے ایک مکمل اور دلکش اثر کی شکل میں ”سلیبی“ کی تحریر کا باعث ہوا۔

جس کی نود دیکھی چشمہ ستارہ میں نے
خورشید میں قسم میں تاروں کی انجن میں
صوفی نے جس کو دل کے خلوت کدے میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانجن میں
صحا کو ہے بسا یا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کا شانہ چسپن میں

ہر نئے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اُس کا

آنکھوں میں ہے سلیبی تیری کمال اُس کا

”سلیبی“ عرب کی پرانی محبوبہ ہے۔ اور شاعر حقیقت کے کیف کو مجاز میں تخیل کر کے مشرقی شاعری کی روایت کو جس میں مجاز و حقیقت ہمیشہ ایک دوسرے میں عیاں اور نہاں ہوتے ہیں، ایک نئے اور جدید رنگ سے زندہ کرتا ہے۔ عشق حقیقی کے عناصر کی نشوونما پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

اس زمانہ کی عشقیہ شاعری کی چند اخصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ ہر عشقیہ نظم میں اس کا احساس ہوتا ہے کہ جذبہ دل سے نہیں نکلا تخیل ہمیشہ نظم کی تشکیل کا باعث نظر آتا ہے۔ جذبے میں جوش نہیں، اثر نہیں، حقیقت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی داغ رنگین کھلونے بنا رہا ہے اور ان سے تفریحاً کھیل رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اکثر نظموں کی تیو میں کوئی واقعہ یا مشاہدہ یا حقیقی قلبی کیفیت کام کر رہی ہو۔ لیکن کسی طرح یہ واقعہ یا مشاہدہ یا قلبی کیفیت ایسی نہیں ہوتی جو اقبال کو یا بالکل مست کر گئی ہو۔ یا گرا گئی ہو۔ اگر ان پر کوئی اثر پڑا ہے تو وہ اُس سے ضرورت سے زیادہ شعری کام لینا چاہتے ہیں

جذبے کے فقدان کے باعث باوجود تخیل کی رفعت کے زبان اور تناسب کا جامہ جا بجا چاک ہو جاتا ہے۔

زبان کی فطری سادگی، فطری جوش، اور فطری صلیبت کی سب سے زیادہ ضرورت عشیقہ شاعری میں ہوتی ہے۔ اور اقبال کو زبان پر بالکل اختیار نہیں۔ ایک مصرع میں اگر جوش اور اثر ہے تو دوسرا بالکل نہیں پہنچا ہے۔ ضرورتِ شعری کیلئے ٹکڑے کے ٹکڑے زبردستی بھرے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب بالکل غلط ہے۔ اور وہ مناسب جو شاعری کے جسم کے لئے کسی سینہ یا کسی حین جسم سے زیادہ ضروری ہے تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔

اقبال نے ”بانگِ درا“ کی اشاعت کے سلسلہ میں اکثر نظموں پر نظر ثانی کی۔ اور یو۔ پی کے نقادوں کے بے لگام اعتراضات سے کم بے کم اس حد تک متاثر ہوئے کہ زبان کی چند ماہم لغزشیں دور کر دیں۔ پھر بھی عشیقہ نظموں کی حد تک یہ تبدیلیاں کافی نہیں ہوئیں۔ جوش اور صلیبت کے لئے زبان کی اس قدر معنائی کافی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ان کی شہور اور ایک حد تک دلنویز نظم ”حسن و عشق“ کا پہلا بند یہ ہے۔

نورِ نورِ رشید کے طوفان میں ہنگامِ محسّر	جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ یسینِ مستر
چاندنی رات میں ہتاب کا ہمزگ کنول	جیسے ہو جاتا ہے گم نور کالے کرا سچل
موجِ بختِ گلزار میں غنچے کی شمیم	جلوہ طور میں جیسے یہ بیضائے کلیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یوں ہی دلِ میرا

پہلے مصرعے میں وہ سلاست اور روانی اور بے ساختگی نہیں جو ایک لطیف جذباتی نظم میں ہونا چاہئے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ ”سچل“ اس وجہ سے بہت بے محل ہو گیا ہے کہ پوری نظم کے لہجے میں رفعت اور شوکت پائی جاتی ہے اور یہ لفظ جو کسی زیادہ آدھی نظم میں بہا روے جاتا، اس نظم میں باوجود اس کے کہ خالی ”آ سچل“ نہیں نور کا ”سچل“ ہے۔ نظم کی فصاحت اور اجنبی معلوم ہوتا ہے، اور اس ٹکڑے کی وجہ سے تخیل کے رنگ میں ایک ناہموار شوخی ہی پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن بعض جگہ بھی نظم ان بلند یوں تک پہنچ جاتی ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔

تو جو محض ہے تو ہنگامِ محض ہوں میں	حُسن کا برق ہے تو عشق کا محاسل ہوں میں
میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی جو	تیری تصویر سے پیدا میری حیرانی ہے

حسن کامل ہے تیرا عشق ہے کامل میرا

(۳)

مطالعہ فطرت اور حسن و عشق کے عناصر

فطرت کا مطالعہ اقبال کی شاعری کے اولین اور بنیادی عناصر میں سے ہے۔ ان کا مطالعہ فطرت بھی جہز باقی نہیں ڈاڑھی ہے۔ فطرت سے اُن کی قوتِ ادراک مستفید ہوتی ہے۔

اقبال کی شاعری کے حُسن پرست اور عشقیہ عنصر پر اُن کے مطالعہ فطرت کا اثر ہونا ضروری تھا بسبب سے زیادہ جس حُسن نے اقبال کے قلب و ادراک پر اثر ڈالا ہے۔ وہ فطرت کا حُسن ہے۔ فطرت کے مختلف عناصر سے مخاطب ہو کر یا ان کے متعلق اقبال نے نظمیں لکھی ہیں۔

مطالعہ فطرت کی حد تک ورڈ سورتھ کا اثر اقبال پر بہت گہرا پڑا۔ فطرت میں وہ دو چیزیں دیکھتے ہیں ایک تو فطرت کے ایک منظر کا تعلق اور ربط دوسرے منظر سے۔ یہ فطرت کی ایک عاشقانہ کیفیت ہے۔ دوسرے انسان اور فطرت کا موازنہ یہاں وہ ورڈ سورتھ کو چھوڑ کر دلنا روم اور تصوفین کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان فطرت کا منظر کامل ہے۔

چنانچہ ان کی وہ نظمیں جن میں حُسن و عشق کے احساسات مطالعہ فطرت کا نتیجہ ہیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ کہ جن میں وہ فطری عناصر کی باہم محبت، یا کسی منظر فطرت کے حُسن یا کسی کے عشق سے نتائج کا استخراج کرتے ہیں اور اُن سے حُسن اور عشق کے معیار انسانوں کے لئے تیار کرتے ہیں ان نظموں میں فطرت، انسان کے معیار حُسن و عشق اور ترغیب عشق کے لئے نمونے اور مثال کا کام دیتی ہے۔ مثلاً ”جگنو“ کی چمک سے وہ حُسن کے اس تصور تک پہنچتے ہیں۔

حُسن ازل کی پیداہر چیز میں جھلک ہے
انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چنک ہے
یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا
وال چاندنی ہر جو کچھ یاں درو کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دہو کے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوسے لبیل، بُو پھول کی جھلک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں ہلکے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا عمل ہو

ہر شے میں جب کہ نہاں خاموشی ازل ہو

یا مثلاً ”خیز، ناگفتہ اور آفتاب“ میں سحر کے ”عارضی رنگین“ کی جلوہ فرمائی پرکلی کا ”سینہ رزین کھول دینا۔ انسانی عشق کی اس دعوت کا بہانہ بن سکتا ہے کہ

مرے خورشید کبھی تو بھی اُٹھا اپنی نقاب

تیرے جلوہ کا نشین ہو مرے سینہ میں

اور اس کے بعد انشراح کی یہ کیفیت منقلب ہو جاتی ہے۔

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دوسری میں

صفتِ غنچم ہم غمِ غمخس رہوں نور سے میں

جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں

دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

دوسری قسم کی وہ نظیں جن میں ”مطالعہ فطرت حُسن و عشق کے عناصر کی تحریک کا باعث ہوا ہے وہ ہیں جن میں

اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ فطرت کا حُسن بے سوز ہے۔ فطرت میں محبت کا شہر نہیں۔ فطرت میں اور انسان میں بھی چیز

ماہ الامتیاز ہے۔ انسان کو عشق نے ”حوارت سوز دردوں“ عطا کی ہے۔ انسان میں جلنے اور جلانے کی صلاحیت عطا کی

ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو تمام مظاہر فطرت سے بالاتر قرار دیتی ہے۔ مظاہر فطرت کی زندگی فانی ہے۔ انسان عشق

کی وجہ سے باقی ہے۔ انسان کو محبت کے باعث زندگی دوام حاصل ہے۔ ”ستارہ صبح“ جب اپنی بے شبانگی کی شکایت کرتا

ہے تو اقبال اُسے اپنے ”ریاضِ سخن کی جان پرور“ فضا میں بلاتے ہیں کہ

میں باغیاں ہوں محبت بہا رہے اُس کی

بنامثالِ ابد پائے دار ہے اس کی

یا مثلاً ”انسان اور بزمِ قدرت میں بزمِ قدرت انسان سے کہتی ہے۔

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود نبود

باغیاں ہے تری ہستی پئے گلزار وجود

انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

(۴)

حُسن و عشق کے متعلق فلسفیانہ نظریوں

اقبال کی دو نظریں ایسی ہیں جن میں سے ایک میں محبت کی تعمیر کا نیم شاعرانہ اور نیم مفکرانہ مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور دوسری (جس کا خیال جرمن نثر سے لیا گیا ہے) زوالِ حُسن اور کائنات پر اس زوال کے حزنینہ اثر کا بھکا سا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں نظریوں یعنی ”محبت“ اور ”حُسن و زوال“ میں خیال گہرا ہے، تاہم میں ایک مقصد کا مکرر رہا ہے۔ ان نظریوں کی بنیاد واقعات کے تجزیے پر رکھی گئی ہے۔ اسی لئے بہت وسیع معنوں میں انہیں فلسفیانہ نظریوں کہا جاسکتا ہے۔

ان میں سے ”محبت“ میں عشق کی آفرینش کا ایک مخصوص تصور پیش کیا گیا ہے۔ عشق ایک سرمدی راز تھا۔ جو انسان کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ مگر اس مخلوق نے جس میں موجودیت کے ساتھ بغاوت کی صلاحیت ہمیشہ سے موجود تھی۔ اس راز کو معلوم کر لیا۔ فطرت کی کیفیتوں اور رُوحِ خالص کی مختلف خاصیتوں سے یہ نسخہ تیار ہوا۔ تارے سے چمک چاند سے دلغ بجز بارات سے سیاہی بجلی سے تڑپ شبنم سے اقداد کی لی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی نغمہائے بیچ اور شان و بوبیت سے اداس بے نیازی کے اثرات لئے گئے۔ اس طرح محبت کی تعمیر ہوئی۔ اور صرف انسان ہی نہیں پوری فطرت اس نور سے گلگامٹی۔

خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے

چمک غنچوں نے پانی، دلغ پائے لالہ زاروں نے

دوسری نظم یعنی حُسن اور زوال کا بنیاد ہی تجلیلِ باہر سے لیا گیا ہے۔ مگر پوری نظم یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو نحو و محسوس کر کے لکھا ہے۔ اس نظم سے دو جداگانہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حُسن اور زوال، لازم و

ملزوم ہیں۔

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی

دہی حُسن ہے حقیقت زوال ہے جس کی

دوسری حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے ہر سین منظر کا زوال، زوالِ حُسن کا ماتم بھی ہے۔

کلی کا نغما سا دل خون ہو گیا نم سے
شباب سیر کو آیا تھا سو گوار گیا

بھرائے بھول کے آنسو پیامِ شبِ بنم سے
چسمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا

(۵)

اقبال کی اردو شاعری میں تصوف کی جھلک

حُسن اور عشق کے تصور اور تخیل میں اقبال کے پختہ تر زاویہ نظر کا پتہ ان نظموں میں چلتا ہے جن میں ایک مالکِ حُسن یا ایک مالکِ حقیقی عشق کا تصور ان کا محرک ہوتا ہے۔ حُسن و عشق کی نظموں میں نیکیوں سے زیادہ بلند ہیں اور ان نظموں سے اُس اقبال کا اندازہ ہوتا ہے جو اگلے چل کر اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عم اور جاوید نامہ لکھنے والا تھا۔

مولانا روم کا اثر اقبال پر اسی قدر ہے، جس قدر اثر پلونا رک کا شکسپیر پر تھا۔ دنیا کا ہر شاعر اُن کے لئے صرف دیکھ لینے کی چیز ہے، مگر مولانا روم کا اثر ان پر ہتدِ چھایا ہوا ہے۔ کئی بڑی حد تک وہ مولانا کی روشنی میں دنیا کے اہم تر مسائل کو دیکھتے ہیں۔

”شعاعِ حُسن“ میں یہ اثر پہلی مرتبہ کلمہ کلمہ ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال نے زندگی کو سمجھنے کے لئے مشرق اور مغرب دونوں کے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ بہت مُدت تک اُن کو حقیقت اور سکون کی جستجو رہی۔ بہت دنوں تک ذوقِ استہمام اُن کو پریشان کرتا رہا؛ جب اُن کو سکون ملا تو تصوف میں ملا۔ غزالی میں نہیں مولانا روم میں۔

اس جستجو اور کاوش کا مکمل ترین اظہار ”سچہ اور شمع“ کے آخری حصے میں ہوا ہے۔ صرف ظاہری حُسن کی نزد شاہ کو تسکین نہیں دے سکی۔ رُوح کسی اور سکون کے لئے بیتاب ہے۔

عقلِ قدرت ہو ایک دریا ئے بے پایاں حُسن
حُسن کو ہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہو
چشمہ کُہسار میں، دریا کی آزادی میں حُسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن
ہر کی شوگستری شب کی سیر پوشی میں ہے
شہر میں صحرایم اور انے میں آبادی میں حُسن
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہی یہ خُش جبر

حسن کے اس عام جلوے میں مجی یہ بیجا ناب ہے
زندگی اس کی مثال ماہی بیٹے آب ہے

اس حجتو کے بعد تسکین نصیب ہوتی تو اس نخل میں جو مولنا روم نے نہیں کیا ہے۔ "شمع" میں کہنفتیں جو ذہنی
معنوی میں معراج کمال کو پہنچ گئی ہیں جا بجا منعکس نظر آتی ہے۔

صبح ازل جو حسن ہوا دستاں عشق	آواز کن ہوتی تپش آموز جان عشق
چسکم تماکہ گلشن کن کی بہار دیکھ	ایک آنکھ لے کے خواب پریشاں ہنہار دیکھ
مجھ سے خیر نہ پوچھ حجاب وجود کی	شام فراق صبح تھی میرے نمود کی
وہ دن گئے گرفتار سے میں آشنا تھا	زیب و دخت طور مرا آستیانہ تھا
قیدی ہوں اذ نفس کو چمن جانتا ہوں	غربت کے نکلنے کو وطن جانتا ہوں

یاد وطن فرودگی بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمعِ حالِ قیدی و اہم خیال دیکھ	موجود ساکنانِ فلک کا مال دیکھ
بانہ صاحبے جو اس نے تو چاہی مری نمود	تحریر کر دیا تیر دیوان ہست و بود
گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے	بندش اگر چہ سست ہے مضمون بند ہے
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے	عالمِ ظہورِ جسلوہ ذوقِ شعور ہے
یہ سلسلہ زبان و مکان کا کمنہ ہے	طوقِ گلوے حسن تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے کم کر وہ راہ ہوں	اے شمع میں ایسے فریب نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقہ و اہم ستم بھی آپ	بامِ حرم بھی طاہر بامِ حرم بھی آپ
میں حُسن ہوں کہ عشق سرا پاکداز ہوں	کھتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیا ز ہوں

ہاں آشنائے لب ہونہ راز کہن کہیں

پھر چھڑنا جائے قصہ دار در سن کہیں

اس نظم میں فطرت کا کوئی منظر اقبال کی نظر کے سامنے نہیں۔ شمع جو مشرقی شاعری کے لوازمات سے ہے ایک نئے نور کے ساتھ ان کے تخیل میں جل رہی ہے۔ ایک طرف تو وہ اس سے خیرہ کن نور حال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اسے ایک نئی روشنی عطا کر رہے ہیں۔

اور یہ منزل اقبال کے کلام میں حُسن و عشق کے ”سحرِ آفریں“ کے منزلیں ہیں۔

یہ منزل ان کی شاعری کے پختہ تر مذہب یعنی پان اسلامزم میں جا کر فہم ہو جاتی ہے۔ اور مشرق کے نئے روحانی پیغام بن کر ان کی فارسی شاعری میں ایک نئی زندگی اختیار کرتی ہے اور اس روحانی پیغام میں عشق کا تصور وہی ہے۔ جو متصوفین اور سالکین کا دنیا۔ مگر بالکل نئے رنگ میں مغرب سے کمال اکتساب نور کر کے مغرب کی مادیت کے خلاف اس پیغام کو پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اقبال کی شاعرانہ نفسیاتی نشوونما کی جو منزل آتی ہے اس میں عشق اور عمل باہم مل جاتے ہیں ”پیام مشرق“ ”زبورِ عجم“ کے بعض حصوں اور ”جاوید نامے“ میں عشق اور عمل کے مشترک اور کمال مشرقی تصور سے مشرق کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔



میری انشا پر دازی

(از)

غفور احمد صاحب مجددی ششم سال سٹوڈنٹ

افضل گیلج کے پل سے گزرتے ہوئے میں نے سینک کی تال درست کرنے کو ہاتھ اٹھایا سامنے سے ایک صاحب کہنے لگے ”وعلیکم اسلام“ گویا میں نے انہی کو سلام کیا تھا۔ میں زیر لب مسکرایا وہ کہنے لگے ”مزاج شریف“ خوب جان نہ پہچان بڑی نالہ اسلام۔ اب یہ سفید پوش نوجوان راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ”افسوس ہے کہ میں نے جناب کو پہچانا نہیں۔“ بے شک نہ پہچانا ہوگا۔ وہ کہنے لگے لیکن میں آپ کو پہچانتا ہوں بہلا کون ایسا بد قسمت ہوگا جو اپنے ملک کے مشہور ادا سے حضرت شتاب حیدر آبادی کو نہ پہچانتا ہو۔ آج آپ کی عنایت سے شرف تکلم بھی حاصل ہو گیا۔ خوب۔ لیکن افسوس ہے کہ مجھے فرصت نہیں۔ علمی مصروفیتیں ہلکتی ہیں۔ اچھا خدا حافظ ”وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن میں یہ جادہ جاننا ہر ہے کہ ایک بلند پایہ ادیب کے لئے یوں بازاروں میں بات چیت کرنا موزوں نہیں اور پھر وقت قیمتی۔ لیکن یہ قیمتی وقت کہاں گوراہ کر اچی رسٹورنٹ کے وسیع حال میں!۔

تین چار مہینے کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں ادیب کے جون میں نمودار ہوا ہوں۔ روزانہ اخباروں ہفتہ وار رسالوں اور ماہانہ مجلوں میں رنگ برنگ کے عجیب و غریب مضامین برساتی کیڑوں کی طرح دمڑا دمڑا ٹھنک رہے ہیں۔ ملک میں شور مچا ہوا ہے اور ”ابوالیان“ تو ایسا بد بندہ تھا ہی اب اس کے ساتھ ادیب القصر کا خطاب بھی جڑوا گیا ہے۔ مجھے روحانی مسرت حاصل ہے اور روحانیت کا اثر جسم پر پڑ رہا ہے میں اس قدر مسرت سے موٹا ہوا

ہوں کہ میرے قریب سے قریب دوست بھی دور سے پہچاننے میں تامل کرنے لگے ہیں۔ کیا واقعی میں ادیب ہوں؟ کیا سچ میسرے مضامین ادبی ہوتے ہیں؟ اس کا جواب سننے سے پہلے میرے مضامین کی نوعیت اور شانِ نزول ملاحظہ فرمائیے۔

چاند خانوں میں "چار میناری" گپ شپ سن کر دوسرا آیا مضمون نگاری کی مینر پر مختلف رسائل کے مدیروں کے آٹھ دس خطوط موجود ہیں۔ کسی کی فرمائش افسانہ کی ہے کسی کی مزاحیہ مضمون کی۔ کوئی تنقیدی پہلو پر زور دیتا ہے۔ کوئی تاریخی پر۔ کوئی غزل طلب کرتا ہے تو کوئی قومی نظم۔ خطوط پڑھ کر میں نے ایک انگڑائی لی۔ قلم اٹھایا کاغذوں کا پلندہ کھینچا گردن جھکائی اور ایک کھنکار کے ساتھ مضمون نگاری کی مشین حرکت میں آگئی۔ مشکل سے آدھ گھنٹہ گزارا ہوگا ایک تئسی خیز افسانہ آجودہ ہوا۔ قیاس کن زنگستان من بہار مرا۔ افسانہ کا عنوان تھا "ہارون رشید اسلمیہ ٹھیکر میں تین صفحات کے افسانہ میں پندرہ لانی لانی ڈیشین پچھ سات جگہ ناما مچے بارہ تیرہ ادھ آدھ ہاں ہوں جیسے الفاظ اور اللہ اللہ خیر صلاح! تیغ قلم کا دوسرا اور فزاحیہ مضمون پر تھا۔ اس میں کیا تھا؟ کچھ نہیں۔ نغمے میاں کی والدہ کی دہاتا نغمے میاں کی شرارتیں اپنی مفلسی کا دکھ اخباروں پر لے دے اور بس! تنقیدی مضمون کے لئے میں نے دیوانِ غالب اٹھایا درود شریف پڑھ کر تیغ میں سے کھولا پہلا شعور نظر آیا یہ تھا۔

تسمیری کعب خاکسترو بلبل قفسی رنگ اے نالہ فشان جگر سوختہ کیا ہے

پہلے تو شعر کی معنی ہی میری سمجھ میں نہ آئے مختلف شرحوں کی مدد سے پہلے معنی خوب سمجھ لئے اور پھر کھینچ جان کر شعر کو نئے معنی پہنا نا چاہئے۔ سب شاعرین پر لاجز نہیں چڑھے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ غالب سے میں نے اس شعر کے معنی پوچھے تو کہنے لگے کہ "اے معنی مجوز" پڑھو تو مطلب صاف ہے۔ حالی پر لاجز نہیں کرنا ضرور تھا اور تو گنجائش تکلی نہیں جھٹ نہیں جھوٹا بنا ڈالا۔ لکھنا یا کہ میرے نزدیک حالی نے اس شعر کے معنی غالب سے پوچھے ہی نہیں!۔ تاریخی مضمون کا عنوان "چار مینار" سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔ تاریخ دکن حیدرآباد پکنو ریل، تھوڑا اس سے اور تھوڑا اس سے لے کر ایک ٹیکہ جمع کیا اور آنا فانا ایک تاریخی مضمون تیار ہو گیا۔ اس طرح تین گھنٹے میں چار پانچ مضمون تیار ہو گئے۔ یہی غزل تو یہی بائیں ہاتھ کا کھیل۔ داد امر حرم کی بیاض اٹھائی ایک پڑکھتی ہوئی غزل تلاش کی چند منٹ کی محنت سے تخلص بدلا اور خیالات عالیہ "کچھ

یہ ہے وہ ادبیت اور شعاعی جس پر ہم انبائے وطن کی تعریف حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ ہم خوش ہمارے دوست اجاب غنّی لیکن ہمارا ضمیر؛ بے شک وہ مطمئن نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیوں بھئی کیا میں ادیب نہیں؟ وہ کہتا ہے نہیں ہرگز نہیں اور واقعہ بھی یہی ہے ضمیر کی آواز چھوٹی نہیں۔ یہ ایک راز ہے آپ سے کہہ دیتا ہوں اور کہیں ذکر نہ کیجئے گا کہ درحقیقت میں ادیب نہیں!

یہی ادبیت ہے جس کے بل پر میں اپنے کو ادیب سمجھنے لگا ہوں یہی۔ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ میں ادیب نہیں اگر میں ادیب ہوتا تو شہرت اور سجاوٹ کے شہد پرکھی بن کر نہ گزرتا۔ اگر میں ادیب ہوتا ان غیر ذمہ دارانہ اور پرتحریروں پر مطمئن نہ ہو جاتا۔ فطرت کی وسیع و عریض کتاب میرے سامنے کھلی ہوئی تھی میں اس کے معالجہ میں غور ہوجاتا۔ اپنی عمر صرف کر دیتا اور ادب بشر و نظم کے جواہر ریزے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ قصرتی کے بام و در ان ترانوں سے گونج اٹھتے۔ تاریخ عالم کا بحر زخاریہ کے سامنے موجیں لے رہا تھا۔ اگر میں چاہتا تھیں و تدقیق کی انتہائی چوٹیوں پر چڑھ کر باہر غوطہ زن کی طرح اس بحر کی تہ میں اتر جاتا۔ ہزار جہد و جدوجہد آبدار موتی نکال لانا کہ خواہ وہ تعداد میں زیادہ ہوتے مگر لوگوں کی آنکھوں سے غلط نہیںوں کے پر سے اٹھادیتے۔ شبلی و شکر کی روئیں قبر سے نعرہ تحسین بلند کرتیں۔ اگر میں ادیب ہوتا تو جمال یا کا ایسا نقشہ کھینچتا کہ دنیا جمال معلوم ہوتی۔ کسی کی آنکھ کا تصور باندھتا تو کل کائنات آنکھ بن جاتی۔ فراق کا قصہ چھڑتا تو دل ہل جاتا۔ دنیا مجھ سے فائدہ اٹھاتی اور میں دنیا سے۔ اگر میں ادیب ہوتا تو عالی کو جھوٹا غالب کو گندم نما جو فروش نہ لکھتا۔ اور اگر لکھتا تو ان دلائل سے لکھتا کہ دنیا پکارا اٹھتی ہاں وہ جھوٹے اور بھارتے۔“

غرض میں ادیب ہونا تو میری نظر لطیحات سے گزر کر تہ پر پہنچتی۔ جو لکھتا تھیں، ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے لکھتا۔ روزانہ نہیں سال میں آٹھ مضمون لکھتا لیکن وہ ادب کی جان ہوتے یکبیت میں حقیر اور کیفیت میں اعلیٰ ادب تیار کرے چاہے دنیا کچھ ہی کہتی میں ہی کہتا۔

شاد م از زندگی خویش کہ کار سے کردم

شاعری و افلاس

(از)

محسن بن شبیر صاحب - بی اے - متسلم ال ال - بی

کیا شاعری منحوس ہے؟ ہندوستان میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ شاعری و افلاس لازم و ملزوم ہیں اور شعر گوئی کا قدرتی نتیجہ نحوست ہے۔ بہ الفاظ دیگر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو شعر کہنے ہی سے آدمی منحوس ہو جاتا ہے یا کارخانہ نقدیر سے شعر گوئی کا پھسکا اُسی کو پڑتا ہے جو آئندہ زندگی میں منحوس بننے والا ہوتا ہے۔ ایک حد تک اس خیال کی تائید بعض نامی گرامی شعرا کی حالت اور ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ اور بد نصیبی سے بعض نامور شعرا کے کلام نے جو مفلسی کا شکار ہو گئے تھے اس خیال کو اور بھی پختہ کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ دنیا اچھی باتوں کو بھول جاتی ہے اور بُری باتوں کو بہت یاد دہکتی ہے جن شاعروں نے عیش و عشرت کی زندگی بسر کی لوگ ان پر توجہ نہیں کرتے لیکن جن کو مصیبتوں نے گھیرا ان کے ساتھ اب بھی دل و زبان سے ہمدردی کی جاتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ بعض سلاطین عظام شاعر گزرے ہیں بہت سے نامور اُمراء کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ فارسی اور اردو کے ہزاروں شاعر ایسے ہیں جو آسودگی و تول کے اعتبار سے کسی اور طبقے کے افراد سے کسی طرح کم نہ تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ "خزانہ عامرہ" میں تقریباً ایسے دیرہ سو شاعروں کا ذکر کیا ہے جو گراں بہا مصلد و انعام سے مالا مال تھے ان میں سے بعض کے منہ موتیوں سے بھر دیئے گئے تھے۔ ایک آدھ ایسا ہے جس کو ہاتھی کے وزن کے برابر چاندی انعام میں ملی تھی۔ خود ہمارے زمانے میں خواجہ اسمعیل کے ریزہ چین اور بارگاہ عثمانی کے وابستہ دہن اعیان دولت دار کا سلطنت امرائے

کامگار و عہدہ دارانِ ذی اقتدار ایسے ہیں جو شاعر بھی ہیں اور فضلِ خدا و تائیدِ خداوندانِ میرانہ زندگی گزار رہے ہیں بہر حال یہ خیال کہ شاعری و افلاس میں چولی دہن کا ساتھ ہے قطعاً غلط ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر یہ خیال کیوں نہ پیدا ہو گیا کہ شعر گوئی و سخنوری سے انسان مفلس ہو جاتا ہے۔ میری رائے ناقص میں بعض وجوہ ایسے ہیں جن کے سبب سے عوام شاعری کو افلاس کا مترادف سمجھتے ہیں اور یہی خیال مدتوں سے چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ ناسخ کے ایک شاگرد آغا ناکب حسین خاں نادرنے جو ڈپٹی کلکٹر (مددگار و مقرر) تھے اس دہم کی تردید اس طرح کی ہے:-

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے

شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

مگر اس پر بھی بعض لوگ شاعری کو منحوس ہی سمجھتے رہے اور کسی صاحب نے مذکورہ بالا شعر کی تردید اس طرح کی:-

لوگ سچ کہتے ہیں فنِ شاعری منحوس ہے

لاٹھرتو ہوتا مگر ڈپٹی کلکٹر رہ گیا

شاعری کو منحوس خیال کرنے کے مختلف وجوہ | اس مسئلہ پر زیادہ غور کرنے سے مجھے بھی بعض وجوہ ایسے نظر آتے ہیں جن کے باعث شاعری و مفلسی دو توام نہیں سمجھی جانے لگیں۔

اول وجہ اُن شاعروں کا طرزِ عمل ہے جو کوئی نوکری یا کوئی دھند انہ کر کے ہر وقت ہاتھیں کاغذ پینسل لئے رہتے ہیں جن کو اُنٹے بیٹھے، سوتے جاگتے قافیہ پیمانی کی دہن لگی رہتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ باہر اور بے ہمت نہیں ہرتے صرف شاعری کے پیچھے ہی لٹے پھرتے ہیں اس سے اُن کے اسبابِ معیشت پر بھی اثر پڑ جاتا ہے اور وہ ہمتِ نخست بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ اعتدال سے بڑھ جانے کی وجہ سے خود بھی دیوانے یا منحوس مشہور ہو جاتے ہیں اور شاعری کو بھی بدنام کرتے ہیں۔

دوسری وجہ شاعری کو منحوس سمجھنے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب فارسی شعراء میں مدحیہ قصیدہ گوئی کا رواج ہوا اور قصیدے کی تمہید یا تشبیب کے لئے مجلہ دوسرے معنایں کے نقلی و خود ستانی، شکوہ آسمان، ناقدری، زمانہ، و گلہ، تقدیر وغیرہ چند خاص موضوع متکرر کر دیئے گئے تو اس ضمن میں بعض شاعروں نے جو حقیقت میں مفلس و تلاش نہ تھے اپنے مدوح کی رگب سخاوت کو جوش میں لانے کے لئے اور اسی سے خاطر خواہ انعام حاصل کرنے کے واسطے اپنی قابلیت کا اظہار اور زمانے کی ناقدری

کا شکوہ کر دیا اور خلاف واقعہ اپنے کو سخت مصیبت زدہ ظاہر کیا۔ ایسے قصائد کے سننے سے ممکن ہے کہ اُن کے زمانے میں بھی لوگوں کو اُن کی تکلیف کا تصور ہوا ہو لیکن اُن کے بعد تو یقیناً ان کی مناشی اور بناوٹی حالت زار پر لوگوں کو ترس آنے لگا۔ اور اس قسم کے شاعروں کی نسبت یہ خیال گزرنے لگا کہ وہ بیچارے بڑی عمرت و فلاکت میں مبتلا تھے۔ اس کی مثال میں حیدرآباد کے ایک مشہور شاعر کا سچا واقعہ لکھ دینا بے محل نہ ہوگا۔

ایک صاحب جو اچھے شاعر ہیں سرکاری دفتر میں نژاد روپیے کے ملازم ہیں۔ سچاس روپیہ اُن کو تاریخ کوئی غزویہ کے صلہ میں بطور منصب بھی ملتا ہے۔ ایک بڑے امیر کے ہاں وہ معتمد خانگی ہیں وہاں سے بھی اُن کو سوا سو روپیہ ماہوار ملتی ہے۔ وہ ایک قصیدہ لکھ کر اور فریم میں لگا کر ایک مقررہ عہدہ دار کے ہاں پہنچے اور اُن کو نذر دیا۔ اس قصیدہ کی تمہید میں اپنی حالت کا انھوں نے ایسا دردناک نقشہ کھینچا تھا کہ وہ عہدہ دار بے حد متاثر ہوئے اور سمجھے کہ مقررہ فائدہ کے اس شاعر کو برا حال کر رکھا ہے وہ بہت ہی شرماتے شرماتے میں روپیہ اُن کو دینے لگے۔ ہمارے شاعر نے اُس وقت فرمایا کہ مجھے روپیے کی ضرورت نہیں ہے آپ کی ہربانی سے میری آمدنی ڈھائی تین سو روپیے ماہانہ ہے۔ یہ تو صرف شاعری تھی۔ میری اصل غرض یہ ہے کہ آپ میرے سالے کو اپنے دفتر میں کوئی جگہ دیدیجئے۔

غرض کہ یہ امر قرین قیاس ہے کہ شاعروں کی گریہ وزاری جو اُن کی زندگی میں بالکل بے موقع تھی امتداد زمانہ کے باعث حقیقت اور واقعہ تصور ہونے لگی۔ اور جب شعراء کے قصائد میں ایسی قسم کی مرثیہ خوانی بکثرت نظر آئی تو پڑھنے والوں کی یہی گمان ہونے لگا کہ جس شاعر کو دیکھو یہی رونا رو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوتا گیا کہ شاعر ہمیشہ بڑی مصیبت میں رہتے ہیں اور شاعری افلاس کی جڑ ہے۔ یہاں تک کہ آگے چل کر کسی شاعر کو آسودگی کی حالت میں دیکھنے پر تعجب ہونے لگا۔ چنانچہ دولت شاہ نے خواجہ بہام الدین تبریزی مشہور شاعر کے حالات میں بڑی حیرت سے لکھا ہے کہ جب اُس نے صاحب دیوان شمس الدین کے فرزند خواجہ ہارون کی دعوت کی تو اُس کے دسترخوان پر چینی کے چار سو رکابیاں موجود تھیں اور تعجب کیا ہے کہ اگلے زمانے میں شاعر ایسے ایسے مال دا بھی ہوئے ہیں۔ اگر دولت شاہ ہمارے زمانے میں ہوتے تو دیکھتے کہ ایک معمولی شاعر کے دسترخوان پر دعوتوں میں چینی کی دو دو ہزار رکابیاں چُن دی جاتی ہیں۔

ایک تیسری بڑی وجہ شاعروں کو مفلس سمجھنے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اردو فارسی کے بعض نامور شعرا حقیقت میں

بہت سنگدست گزرے ہیں۔ اور کبھی کبھی اُن پر ایسا وقت بھی آ گیا ہے کہ وہ انتہائی اِخلاس میں زندگی کے دن تیر کرتے تھے۔
سعدی اور اِخلاس | اس قسم کے شاعروں میں حضرت سعدی کا نمبر اول ہے۔ دنیا کے تمام فارسی پڑھے ہوئے ان کے
کلام سے تعقید ہوئے ہیں۔ ہر فارسی خواندہ کو اُن سے ایک خاص عقیدت ہے۔ گلستان و بوستان میں کئی مقام پر ان
کے اِخلاس کا تذکرہ ہے جسے پڑھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ کبھی کوفے کی گلیوں میں ننگے پاؤں پھرتے دیکھائی دیتے ہیں
کبھی قیدِ ننگ میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس دس روپے نہیں کہ قید سے رہا ہوں۔ ایک وقت اُن پر ایسا آتا
ہے کہ اُن کے پاس صرف چار آنے ہوتے ہیں اور وہ بصدِ حسرت اپنے ساتھی کو چھوڑ کر کشتی میں روتے ہوئے سوار ہو جاتا
آخر عمر میں جب یہ سیاحت سے واپس آتے ہیں تو اپنی پریشانی حالی یہ ایک قصیدہ میں صاحبِ دیوان شمس الدین
کو ان لفظوں میں لکھتے ہیں۔

زر روزگار بہ رنجِ ہم چنانکہ نتواں گفت

بہ خاکِ پائے خداوند روزگارِ مبین

خواجہ علاء الدین حاکم عراق کو اپنا قصیدہ لکھتے وقت ان کی فلاکت اور بڑھ گئی ہے :-

اگر غنیمتِ شعوم روان شود چہ موجب
کوکہ جو دی و من در میان و رط فخر

کہ می رود بہ سسرم از تور دل طوفان
گر بہ شش رطہ اقبال او قسم بکران

انوری کی مصیبت | انوری قصیدے کا پیغمبر بنا جاتا ہے۔ اس کے بعض قصائد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی تمام
عمر بھی پریشانی ہی میں گزری ہے جس طرح یہ مصائب و آلام کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اُس کا ثبوت اس قطعے سے ملتا ہے
جو زبانِ اُردو میں بھی ضربِ اِشہل ہے۔

ہر بلائے کز آسمان آید

گرچہ بردیگرے قضا باشد

برزین نارسیدہ می گوید

خانہ انوری کجسا باشد

ظہیر فاریابی کا شکوہ | ظہیر فاریابی جو قصیدے کا بڑا استاد ہے اور انوری کی نگرہ کا یا اُس سے کم و بیش تصور
کیا جاتا ہے اپنے اُس مشہور قصیدے میں جو قولِ ارسلان کی مدح میں اُس نے لکھا ہے اِخلاس سے مجبور ہو کر بادشاہ

اس طرح طعنہ دیتا ہے :-

شاید باکہ بعد خدمت سہ سالہ در عسراق

تاخم ہنوز خسرو مازندران دھند

یعنی کیا یہ مناسب ہے کہ تین برس سے میں تمہارے دروازے پر پڑا ہوا ہوں اور ابھی تک حاکم مازندران مجھے روٹی دے رہا ہے۔

ابن سینا کی مغلسی | فارسی قطعہ گوئی کے مسلم الثبوت استاد ابن سینا کی تقریباً ساری عمر روتے ہی گزری۔ فرماتے

محنتِ دورانِ درنجوری ووز بکھی

وقتِ اجاب و تنہائی و غربت بر سر

این ہمہ برمن ز جو رد و پر چرخِ چنبری است

اے مسلمانانِ فغان از دو پر چرخِ چنبری

یہ بیچارے گھر میں بھوکے رہتے ہیں مگر اپنا پوزیشن سنبھالنے کے لئے بازار میں جھوٹی جھوٹی ڈکائیں لیتے ہیں:

حالت از فقر و فاقہ است چنانکہ

نرسد نان بہ ترہ۔ ترہ بہ دوش

وز برائے رعایتِ ناموس

سے کشم برگزشتگی آرد

مخبر دوسرے مدد و مہین کے طغان تیمور خاں حاکم مازندران بھی ان کا کسی وقت میں سر پرست تھا مگر وہ کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ کھاتے کیا مٹی ہو؟ لاجواب قطعہ ہے۔ ملاحظہ ہو :-

یارب چہ موجب است کہ روزے گفت شاہ

کابن سینا بیدلِ شیدا چہ می خورد

چون ہر چہ داشت رفت بتاراجِ حادثات

وزمانیافت ہیچ پس آیا چہ می خورد

باشد ملازمِ دربار، سچو آستان

جز خاکِ این جنابِ معلیٰ چہ می خورد

افلاس کے پانچ پہلو | اس قسم کے مغلس شاعروں میں سے ایک شخص نے اپنے افلاس کی وہ تصویر کھینچی ہے کہ باید و شاید اس کے لڑکے نے اس سے کچھ روپیے مانگے تھے جس کا یہ جواب دیا۔

بابا مگر تو سفرۂ بے نان ندیدہ

جنگِ میانِ وگر یہ طفلان نہ دیدہ

نشستہ بگوشہ از بیسم قرصخواہ

ناگزرد در آید ہمسماں ندیدہ

میر صاحب کی ضعفِ نالی | اردو کے مفلس استادوں میں میر صاحب قبلہ نمبر ایک ہیں۔ اگرچہ بعض وقت بظاہر ان کی حالت

اچھی بھی دکھائی دیتی ہے اور وہ معقول تنخواہ کے ملازم بھی ہو جاتے ہیں مگر وہ خودیہ فرماتے ہیں :-

زمانے نے رکھا مجھے مُتصِل

پراگندہ روزی پراگندہ دل

انہوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان کے افلاس کا فوٹو ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں گئے پریشان گئے۔ جہاں رہے پریشان رہے۔ مثلاً

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی

کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں

آگرے سے دہلی پہنچے۔ اب دہلی میں بھی ان کے مگرشت ملاحظہ فرمائیے :-

دلی میں بے دلانہ پھسرایا میرے تئیں

کا ما سے تلخ کام اٹھایا میرے تئیں

میر صاحب کے کئی محسن ایسے ہیں جن میں ان کی فلاکت کے سبب نظر آتے ہیں اور بڑا رنج ہوتا ہے کہ ایسا صاحبِ کمال اور ایسا پریشان۔ ایک محسن میں خود انہوں نے اپنی حالت کی تصویر ان الفاظ میں دکھائی ہے :-

مالت تو یہ کہ جگو غموں سے نہیں فراغ

ہے نام مجلسوں میں میرا سیرید دماغ

از بس کہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

سودا کی بے روزگاری | سودا نے جو دو شہر آشوب رکھے ہیں وہ ان کی حالت کے دو آئینے ہیں۔ اُس زمانے میں

ملازمت حاصل کرنے کا یہ عام طریقہ تھا کہ ایک گھوڑا خرید کر کسی راجہ یا فزاہ کے ہاں چلے جاتے تھے اور سواروں میں

بھرتی ہو جاتے تھے۔ ملک اشعرا سودا کو یہ نوکری بھی نہیں مل سکتی۔ فرماتے ہیں :-

کہا میں نے سودا سے اک روز کیوں تو ڈوانا دلا

پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو کیسے گھوڑا مول

لگا وہ کہنے کہ اس کے جواب میں دو بول اگر کہوں گا تو سمجھ گیا تو کہ ہے یہ ٹھٹل

بتا کہ نوکری بگتی ہے ڈھیسریوں یا تول ؟

ایک قصیدے میں فکرِ معاش سے مایوس ہو کر فرماتے ہیں :-

یاں فکرِ معیشت ہے وہاں دغدغہ حشر

آسودگی حرفیست۔ یہاں ہے نہ وہاں ہے

مصحفی کی تنگدستی | اردو کے مشہور شاعروں میں سب سے زیادہ افسوسناک حالت مصحفی کی نظر آتی ہے۔ یہ غز

تھما زدہ لوگوں کی طرح اپنے بچوں کو فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ مختلف پرچوں پر یہ مشاعرہ کی طرح پر شکر کہہ کر لکھ لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے شوقین آٹھ دس آنہ روپے بارہ آنے تک اچھے اچھے شعر چھانٹ کر غزل بنا کر بیجاتے تھے۔ یہ غزل خریدار کا دل دیا جاتا تھا۔ بچے کھپے شعر مصحفی کے حصے میں آتے تھے جن پر بعض وقت کوئی داؤ بھی نہیں دیتا تھا۔

مصحفی شہزادے مرزا سلیمان شکوہ کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ ان کے پاس سے کچھ تنخواہ ان کو ملا کرتی تھی

جب سید انشا وہاں پہنچے تو شہزادے صاحب ان کو اپنا کام دکھانے لگے اور مصحفی کی تنخواہ میں کچھ تخفیف کر دی جس پر انہوں نے ایک معروضہ پیش کیا۔ اس نظم کو پڑھئے اور خدا کا شکر کیجئے۔

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق تھا مرد مسمر کہیں دس میں کے لائق

لے لے والے کہ کچپیں سے اب پانچ ہوئے میں ہم ہی تھے کسی وقت میں کچپیں کے لائق

استا؛ کا کرتے ہیں امیر اب کے معزز ہوتا ہے جو در ماہرہ سائیس کے لائق

انشا کا دردناک انجام | انشا کی آخری عمر کے افلاس کے جو مناظر شمس العلماء آزاد نے آبِ حیات میں دکھائے ہیں

وہ صحیح ہیں تو ان کے بعد عبرت کے لئے کسی اور آئینہ کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تو ضیحا سعادت یار خاں

رنگین کی انشاء سے چوتھی ملاقات کی کیفیت نقل کی جاتی ہے۔ سعادت یار خاں کہتے ہیں :-

”چوتھی مرتبہ جو لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس جس دروازے پر ہاتھی جموستے تھے وہاں دیکھا کہ فناک

اڑتی ہے اور کتے ٹوٹے ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی۔ اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی ؟ وہ ان

کی بی بی تھیں میں نے کہا کہ سعادت یار خاں ولی سے آیا ہے۔ چونکہ سید انشا سے انتہائی درجہ کا اتحاد تھا اُس عقیقہ نے پہچانا۔ دروازے پر آکر بہت روئیں اور کہا کہ بھئی اُن کی تو عجب حالت ہے۔ اسے لو میں ہٹ جاتی ہوں تم اندر آؤ اور دیکھ لو۔ میں اندر گیا۔ دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ تن برہنہ ہے۔ دونوں زانوں پر سر دہرا ہے آگے رکھ کے ڈھیر ہیں۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے۔ یا تو وہ شان و شکوہ کے جگمگتے دیکھتے تھے۔ وہ گرم چوٹی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتیں تھیں یا یہ حالت دیکھی۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا سید انشا۔ سید انشا سر اٹھا کر اُس نظر حضرت سے دیکھا جو کہہتی تھی کہ کیا کہوں آنکھ میں آنسو ہیں۔ میں نے کہا کیا حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شکر ہے۔ پھر اس طرح سر گولگھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا۔

ہجو کا صلہ | انشا کے زمانے کے ایک مفلس شاعر فایق نے فقروفاقے سے تنگ آکر اُن کی ہجو کہی تھی انہوں نے پانچ روپے سے اُس کا منہ اس طرح مار دیا۔

فایق بیجا چو ہجوم گفت
دل من سوخت سوخت سوخت بہ

صلہ اشس پنج روپیہ دادم
دین سگ بہ لقمہ دوخت بہ

جرات کی بیوائی | جرات بھی جن کو انشا نے ”ہندوستان کا شاعر“ کہا ہے شاہ نصیر کی طرح اکڑ رہے ہیں اور نواب محبت خاں کے مختار کو یوں صلواتیں سنارہے ہیں۔

مختاری پہ کچھ آپ نہ کیجئے گا گھمنڈ
کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیچ ازند

سرمائی دلدادہ تجھے ہماری ورنہ
تم کھاو گے گالیان جہرم کھا ئینگے ٹھنڈ

جب لکھنؤ میں جرات مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے وہاں بھی کسی وقت تنخواہ بند ہوئی اور اُن کو کہنا پڑا۔

جرات اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم

جبکہ اللہ ہی نہ دیوے تو سلیمان کب دے

شاہ نصیر پر سر دی کا صلہ | شاہ نصیر جو ذوق کے ہی استاد ہیں اور ہمارے حیدرآباد میں حضرت شاہ

موسیٰ قادی کے احاطے میں آرام فرما رہے ہیں۔ جن دنوں دہلی میں تھے شاہِ عالم سے جڑا اول (سرکاری لباس) کی فرمائش اس طرح کرتے ہیں۔

پچائے گا تو ہی اے میرے اللہ کہ جاڑے سے پڑا بیڈ تھپ ہے پالا
پناہ آفتاب اب جھکو بس ہے اڑھائے گا وہی جھکو دو شالا

لے سنی
شیخہ عالمگیر

ذوق کی آشفتمہ حالی ازبانِ اردو کے بعض اور استادوں میں بھی کسی نہ کسی وقت افلاس کا دور دورہ رہا ہے مثلاً ذوق ابتدا میں سات روپیے ماہوار کے ملازم ہوئے تھے۔ آخر میں دو سو روپیے تنخواہ بھی ہو گئی تھی مگر یہ کس کی تنخواہ ہے، ملک اشعرا خاقانی ہند کی۔ ذوق کی پریشان حالی کا یہ شعر بہترین شاہد ہے۔

یوں پھر میں اہل کمال آشفتمہ حال افسوس ہے

اے کمال افسوس ہے تجھ پر۔ کمال افسوس ہے

نظیر اکبر آبادی کی تنخواہ | نظیر اکبر آبادی جن کے قدر دانوں کا دائرہ اب روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ایک خانگی مکتب میں سترہ روپیے مہینے پر پڑھاتے تھے۔

غالب کی شہِ خرچی و افلاس | اس قسم کے شعرا میں حضرت غالب سب کے صد نشین ہیں۔ اگرچہ ان کے علم و فضل کے اعتبار سے ان کی کسی وقت بھی قدر نہ ہوئی پھر بھی آخر وقت میں ان کی مجموعی آمدنی کچھ اوپر دو سو روپیے ماہانہ تھی۔ گران کے اخراجات کے مقابلہ میں محض ناکافی تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے خطوط و اشعار وغیرہ میں جا بجا اپنی تکلیف کا اظہار کیا ہے۔ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ دہلی کے آخری تاجدار کی سرکار سے جو ان کو پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ کی فضا بھی ملا کرتی تھی اس سے بھی ان کے حساب میں بڑی کھنڈت پڑتی رہتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ماہ بہ ماہ ایصالِ تنخواہ کے لئے ایک معروضہ پیش کیا۔ جو سبب شہرت محتاج اعادہ نہیں ہے۔ یاد دلانے کے لئے دو تین شوکھدیئے جاتے ہیں۔

ذوقِ آرائشِ سر و دستار

پیرو مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں

جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر

آپ کا بندہ اور پھر سے ننگا آپ کا نوکرا اور کلمے اود ہار

عبد اور تسخیر مفلس شاعروں میں فارسی کا مشہور نہرل گو شاعر عبید زاکانی جس کی کتاب "موش و گریہ" عثمانیہ ریفریوٹی کے ایف۔ اے کے نصاب میں ہے بڑا فاضل اور اچھا شاعر تھا مگر مفلسی نے اس کو ایسا بنا دیا کہ اُس نے تمانت و سنجیدگی کو سلام کر کے مسخرے پن پر کمر باندھ لیا ایک نظم میں اُس نے اپنی قرضداری کی کیفیت لکھی ہے:

مردم عیشیں خوشدل و من بتلا سے قرض ہر کس عیشیں شائل و من در بلا سے قرض
 در کوچہ قرض دارم و اندر محسلہ نیز در شہر قرض دارم و اندر سرائے قرض
 عرضم چو آبرو سے گدایاں بباد رفت از بسکہ خواستم زور ہر گدا سے قرض

دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہیں کہ پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر ناک میں شریک ہو جاؤ۔

اے خواجہ کمن تا بتوانی طلب علم کاند طلب راتب ہر روز بمانی
 رو۔ مسخرگی پیشہ کمن و مطربی آموز تا گنج ز راز کہتر و ہمتہر بستانی

شاعروں کے مفلس مشہور ہوجانے کی ایک وجہ اور معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ بعض شاعر معقول آمدنی رکھتے تھے مگر اپنے اخراجات کثیر اور شر خرچ ہونے کے سبب سے وہ آمدنی ان کو کافی نہیں ہوتی تھی اور مجبوراً ان کو اپنے مدوح سے اس قسم کی گزارش کرنی پڑتی تھی جو کسی مفلس و قلاش کو کرنی چاہئے۔

ایک شاعر کا تمک | میں اس قسم کے شعرا میں سے جو حقیقت میں محتاج نہ تھے ایک شاعر شمس الدین طبعی کا ذکر کر کے اپنا مضمون ختم کر دیتا ہوں۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"یہ باوجود فضل و کمال کے شاعری میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اور مشہور آفاق وزیر نظام الملک طوسی کے مصاحب تھے۔ اس کی مدح میں انھوں نے بڑے بڑے قصائد لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ ان کی طرف بی مفلسی کا پھیرا ہو گیا تھا انھوں نے وزیر موصوف سے ایک ہزار دینار قرض لئے اور حسب ذیل تمک لکھ دیا:-

(تذکرہ طبقہ سوم صفحہ ۷۴)

یہ تسک بہت ہی ظریفانہ پیرایہ میں لکھا ہے۔ اس میں جا بجا آیات قرآنی بھی بڑے مزے سے تحریر کی ہیں جس میں ایک تسک کا مطلب خیزارہ و ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ اہل تسک میں جن جن مقامات پر قرآنی آیتیں آئی ہیں ان کو ترجمہ میں اعراب نقل کے درمیان لکھ دیا گیا ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "خدا کو قرض دو مگر بلا سودی قرضہ"

اس حکم کی تعمیل میں صاحبانِ نعمت و اربابِ ہمت ہمیشہ انعام و اکرام سے اہل اللہ کی مدد فرماتے رہے ہیں چنانچہ مخدوم معظم سلطان الوزرا خواجہ نظام الملک ہتمو خزانہ سخا و کرم نے اللہ تعالیٰ اُس کی دولت قاہرہ کو دن و رات چوٹی ترقی دے اور اُس کے دربار گہر بار کو قائم رکھے مبلغ ایک ہزار دینار نفوی سکھ راج اوقت کا تب حروف مغلن نادار شمس الدین طیبی کو بھی قرض دیئے ہیں۔ اور من مقرر مبلغ مذکور اپنے قبضہ و تصرف میں لایا ہے۔ اگرچہ رقم مذکور کی ادائیگی حسب وعدہ اُس کا معاوضہ دہیچند ہر گاہ خدا سے عذوجل کے ذمہ ہے۔ تاہم من مقرر اُس کو اپنے ذمہ لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں ایک قطعہ باغ بہشت نظیر واقع بلدہ "یلبہ علاقہ رب قدیر" محدودہ ذیل تمام و کمال رہن و کفول کرتا ہے کیفیت اس بلغ کی یہ ہے کہ اس کے درختوں کی "جڑیں زمین کے اندر ایں اور شاخیں آسمان تک پہنچ گئی ہیں" اس کے ایک پودے میں سات سات بالیں اور ہر بال میں سو سو دانے لگتے ہیں اور ہر دانہ "مثل روشن ستارے کے ہے" اس کا کٹوالا "باب کٹوا ہے" اس کا دروازہ ایسا کہ "داخل ہو جاؤ سلامت و امن کے ساتھ" اور اس کی پیمائش یہ ہے کہ اس کا عرض "زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہے" اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ بلغ مذکورہ مرتہن صاحب کے پاس رہن رکھ کر من مقرر بیوان اجارہ مرتہن صاحب موصوف سے کرایہ پر لیکر اپنے قبضہ اور تصرف میں لایا ہے۔ مرتہن صاحب موصوف کا چونکہ من مقرر "اجر عظیم" ہے لہذا عند المطالبہ کہ "اسے نفس مطمئن اب اپنے خدا کی طرف خوشی خوشی رجوع ہو جا" سال کے سال نظم گہر سلک تصائد کے پچاس عدد ہار کہ ہر ایک ان میں کا شمار حکمت آمیز کی ایسی لڑی ہوگی کہ اگر ان کو پہاڑ کے سانسے پڑھا جائے تو وہ بھی خدا کے خوف سے خضوع و خشوع میں آجائے" مرتہن صاحب موصوف کے پاس بلا عدد و حیلہ بلاناغہ پہنچا دیا

مخدوم معظم سلطان الوزرا خواجہ نظام الملک ہتمو خزانہ سخا و کرم نے اللہ تعالیٰ اُس کی دولت قاہرہ کو دن و رات چوٹی ترقی دے اور اُس کے دربار گہر بار کو قائم رکھے مبلغ ایک ہزار دینار نفوی سکھ راج اوقت کا تب حروف مغلن نادار شمس الدین طیبی کو بھی قرض دیئے ہیں۔ اور من مقرر مبلغ مذکور اپنے قبضہ و تصرف میں لایا ہے۔ اگرچہ رقم مذکور کی ادائیگی حسب وعدہ اُس کا معاوضہ دہیچند ہر گاہ خدا سے عذوجل کے ذمہ ہے۔ تاہم من مقرر اُس کو اپنے ذمہ لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں ایک قطعہ باغ بہشت نظیر واقع بلدہ "یلبہ علاقہ رب قدیر" محدودہ ذیل تمام و کمال رہن و کفول کرتا ہے کیفیت اس بلغ کی یہ ہے کہ اس کے درختوں کی "جڑیں زمین کے اندر ایں اور شاخیں آسمان تک پہنچ گئی ہیں" اس کے ایک پودے میں سات سات بالیں اور ہر بال میں سو سو دانے لگتے ہیں اور ہر دانہ "مثل روشن ستارے کے ہے" اس کا کٹوالا "باب کٹوا ہے" اس کا دروازہ ایسا کہ "داخل ہو جاؤ سلامت و امن کے ساتھ" اور اس کی پیمائش یہ ہے کہ اس کا عرض "زمین و آسمان کے عرض کے برابر ہے" اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ بلغ مذکورہ مرتہن صاحب کے پاس رہن رکھ کر من مقرر بیوان اجارہ مرتہن صاحب موصوف سے کرایہ پر لیکر اپنے قبضہ اور تصرف میں لایا ہے۔ مرتہن صاحب موصوف کا چونکہ من مقرر "اجر عظیم" ہے لہذا عند المطالبہ کہ "اسے نفس مطمئن اب اپنے خدا کی طرف خوشی خوشی رجوع ہو جا" سال کے سال نظم گہر سلک تصائد کے پچاس عدد ہار کہ ہر ایک ان میں کا شمار حکمت آمیز کی ایسی لڑی ہوگی کہ اگر ان کو پہاڑ کے سانسے پڑھا جائے تو وہ بھی خدا کے خوف سے خضوع و خشوع میں آجائے" مرتہن صاحب موصوف کے پاس بلا عدد و حیلہ بلاناغہ پہنچا دیا

کروں گا فقط گواہ شد
"اللہ گواہ کافی ہے"

ملٹن اور تقشف

(از)

میرسن صاحبی، عثمانیہ طالب سال ششم

دور تقشف

جو لوگ سترھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے سرکاری کلیساؤں کے مخالف ہو گئے، تھے انہیں متقشفین کہا جاتا ہے۔ متقشفین نے شخصی راست بازی راست کرداری اور مذہبی حریت جوش میں غلو سے کام لیکر نگر نروں کے اخلاق اور طرز معاشرت کو نہایت سخت اور حد درجہ خشک اصولوں اور نظریوں میں جکڑ دیا تھا۔ اسی لئے انہیں اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابتداً ایسے شکسپیر کے عہد کے اوائل میں تقشف Puritans اور متقشفین جیسے الفاظ کے استعمال سے اظہارِ نمر بھی مقصود ہوتا تھا لیکن اب ان کا مفہوم صرف بیانہ رہ گیا ہے۔ چارلس اول کے زمانہ میں انگلستان کے اوسط طبقوں میں اس جماعت کی انتہا پسند ذہنیت پوری طرح سرایت کر چکی تھی، لیکن ایک زبردست قومی قوت کی حیثیت اس کو ہمیں اول کے عہد تک حاصل نہ ہو سکی۔ پھر گو ماگون وجوہات کی بنا پر اس کے زور میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ اعلیٰ طبقہ کی عیش پسندی اور تن آسانیوں نے سنجیدہ اصحاب کو تقشف کا گردیدہ بنا دیا۔ اس طرح اس کا اخلاقی اور سماجی اثر اور بھی بڑھا گیا۔ متقشفین صرف خدا کو مقتدرِ اعلیٰ سمجھتے تھے۔ شاہ چارلس نے عوام کے حقوق اور آزادی کو سلب

رنا چاہا تو انہوں نے نہایت زبردست مدائے احتجاج بلند کی اور اس سماجی اور اخلاقی تحریک نے بالآخر سیاسی شکل اختیار کر کے ایک نہایت نازک موقع پر انگریزوں کی انفرادی آزادی کو حکومت کے دست برد سے بچایا۔ خانہ جنگی کی طوفان خیزی کے بعد کراچول کی کامیابی کی وجہ سے تقشف کو زبردست فروغ حاصل ہوا جس کے اثرات دولت مآ کے چند ہی سالوں میں ہمہ گیر ہو گئے۔ اپنے محدود حلقہ میں تقشف نے انگریزوں کی طرز معاشرت اور طریق تخیل کو بہت متاثر کیا، اُس نے جو رجحان ادب اور زندگی میں پیدا کیا وہ باوجود اپنے محدود محاسن کے نہایت خشک اور ایک حد تک ناقابل برداشت بھی تھا۔ متقشفین کی پاک باطنی خدا ترسی، دیانت داری اور راست بازی قابل قدر ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی تنگ خیالی، تعصب، کٹر پن، اور حزن پسندی پر افسوس بھی ہوتا ہے۔ ان کو سائنس، فنون اور جمالیات سے نفرت تھی تقشف نے انسانی تمدن کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ اور ادبیات کو اپنے مخصوص مقاصد کا تابع بنانا چاہا۔ اس کا وجود نہ صرف فنون لطیفہ کے لئے بلکہ ادبیات کے لئے بھی موت کا پیام ثابت ہوا۔ عام طور پر متقشفین نہایت مستعصب قسم کے لوگ سمجھے جاتے ہیں، لیکن بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ یہ خیال ایک حد تک بے بنیاد ہے ایمیڈن اور ٹامس ہکر کے علاوہ کراچول بھی تقشف تھا جس کی مذہبی رولو داری ایک کھلی حقیقت ہے۔ اس تحریک سے متعلق غلط فہمیوں کے پھیلنے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ برسر اقتدار آتے ہی کراچول نے مختلف قوانین نافذ کر کے عوام کے ہتے کھپ مشاغل کو ممنوع قرار دیا جس کی وجہ سے وہ ایک خشک معیار زندگی کے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن صرف اس بنا پر پوری تحریک کی مخالفت کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ کسی زبردست دریا کے فیضان کا اندازہ اُس کف سے نہیں کیا جاتا جو اُس کی سطح پر نظر آتا ہے۔ اس لئے صرف بعض کمزوریوں کی بنا پر جن کی حیثیت کف ہی کی سی ہے دریا کے تقشف کے فیضان سے انکار کرنا غلط ہی نہیں۔ اس تحریک نے سیلاب حیات بن کر نسلوں کو سیراب کیا اور تقریباً نصف صدی کے اندر انگلستان کی ذہنی و نیاس میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اس عہد میں ایک آدھ ہی مصنف ایسا ملتا ہے جس نے تقشف کے جملہ مقاصد کو اپنے اندر جذب کر کے قدم آگے بڑھائے ہوں۔ سب سے اہم مثال ملٹن کی ہے۔ وہ اس تحریک کی اہم ترین پیداوار تھا۔ اس کے ادبی کارناموں میں تقشف کے سماجی اور اخلاقی معتقدات کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کے وسیع اثرات کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

جان ملٹن

جان ملٹن ۹ دسمبر ۱۸۰۷ء میں بمقام لندن پیدا ہوا۔ نقشبندی رجحانات کے باوجود اُس کے باپ کو ادبیات اور حسن کاری سے خاصا رگاکاؤ تھا۔ یہی خصہ جیسا تہیٹے کوورٹہ میں ملیں۔ ملٹن کی تعلیم سینٹ پال سکول اور پھر کرائسٹ کالج کیمبرج میں ہوئی۔ یہاں سات سال زیر تعلیم رہ کر اُس نے بی۔ اے کی سند ۱۸۲۷ء اور ایم۔ اے کی سند ۱۸۳۲ء میں حاصل کی۔ ملٹن کا مطالعہ نصابی کتابوں تک محدود نہ تھا اور جب اُس نے معلوم کیا کہ مذہبی تعلیم اس کی افتاد طبیعت کے خلاف تھی تو کلیسا کی خدمت کو خیال ترک کر کے اپنی تمام تر توجہ مختلف علوم کی تحصیل اور شعر و شاعری کی طرف مرکوز کر دی۔ خاندان کی مالی حالت اچھی تھی اس لئے معاش کی فکر نہ ہوئی اور جامعاتی تعلیم کی تکمیل کے بعد ملٹن نے اپنے گھر بارٹن میں سکونت اختیار کی، جو لندن سے کوئی ۷۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ایک موقع پر خود ملٹن نے بیان کیا ہے کہ وہ لڑکپن ہی میں راتوں میں دیر دیر تک مطالعہ کرنے کا عادی تھا، جامعاتی تعلیم کے دوران میں بھی اُسے کتابوں اور مطالعہ سے ایسا ہی عشق رہا۔ اس چھ سال کی تنہائی میں اپنے محبوب مشغلہ کو پورے اہٹاک کے ساتھ اُس نے جاری رکھا۔ یونانی، لاطینی، عبرانی، ہسپانوی، فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی ادبیات کے ساتھ ساتھ ریاضی، سائنس اور دینیات کا بھی مطالعہ کیا بنیادیں پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں جامعاتی تعلیم کے بعد مزید مطالعہ نے ملٹن کو علامہ زماں بنا دیا۔ ملٹن کو نہ صرف اپنے علم کی وسعت کے لحاظ سے تمام انگریزی شاعروں میں امتیاز حاصل ہے بلکہ اس کا طے بھی کہ اس کے تجربہ علمی کی ضمایاں میں نے اس کی نظروں کی لطافت اور کیف انگیزی میں چارچاند لگا دیئے ہیں مختلف ممالک کے حالات سے راست واقفیت حاصل کرنے اور تجربہ کے ذریعہ تعلیم کو مکمل کرنے کی غرض سے تیس سال کی عمر میں ملٹن سفر پر روانہ ہوا۔ پیرس کی سیر کے بعد اٹلی پہنچا تو انگلستان کی داخلی اتری کی اطلاع ملی اور واپسی پر مجبور ہوا، چنانچہ ملٹن نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ جب میں نے اپنے ہم وطنوں کو حیرت اور آزادی کی کشش میں مبتلا دیکھا، تو خیال کیا کہ ایسے وقت میں وطن سے دور آرام اور فراغت سے زندگی بسر کرنا مناسب نہیں۔ اس لئے یورپ میں تقریباً پندرہ مہینے گزارنے کے بعد ۱۸۳۹ء میں لندن واپس ہوا اور شاہ پسندوں کے خلاف مختلف مضامین لکھ کر بڑی ہیہیت حاصل کر لی۔ دولت عامہ کے قیام کے بعد ملٹن کو امور خارجہ کی کئی کاٹھنی محنت

بنادیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں اس نے ایک نو عمر لڑکی میری پاول سے شادی کر لی۔ ازدواجی زندگی بڑی تلخ تھی۔ ۱۹۱۷ء کے اوائل میں ایک قیامت خیز حادثہ پیش آیا یعنی ملٹن کی بعصارت جو ایک عرصہ سے گھنٹی جا رہی تھی، کثرتِ کار کی وجہ سے بالکل زائل ہو گئی۔ تین سال بعد اس نے دوسری شادی کی لیکن بیوی پندرہ مہینے کے اندر ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ عروہ شاہی کے ساتھ ہی ملٹن کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کی دو کتابیں منظر عام پر نہ آئیں۔ رہائی بہت جلد نصیب ہوئی لیکن اس کے بعد وہ ایک سیاسی گمنامی کا شکار ہو گیا۔ اس کی زندگی نفسی اور تنہائی میں کٹنے لگی۔ بے بصری کی مصیبت اس پر مستزاد تھی۔ اس مقصد کی ناکامی کی ٹخیاں جس کے لئے اس نے تمام محنت اور قربانیاں کی تھیں۔ اب پوری طرح محسوس ہونے لگیں۔ پہلی بیوی سے جو لڑکیاں تھیں انہوں نے ملٹن کے حُزن و ملال میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اس تاریک اور اوراند و ہنساک زمانہ میں اس کی توجہ شاعری کی طرف مبذول ہوئی اور اس نے پیراڈائس لاسٹ (فردوسِ گم کردہ) لکھی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں کئی سال قبل ہی قائم ہو چکا تھا۔ یہ بلند پایہ رزنیٹیم ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں پیراڈائس ری گینڈ *Paradise Regained* اور *Samson Aconistis* اور *سائنس اگونسٹس* دونوں ایک ساتھ شائع ہوئیں تین سال بعد ۱۹۱۷ء میں ملٹن کا انتقال ہو گیا۔

ابتدائی نظمیں

ملٹن کی ادبی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جس سے اس کی سخن گوئی اور ذہنی اور دماغی ارتقا کا پتہ

چلتا ہے۔

(الف) کلیڈ کا زمانہ جو کیمبرج کی طالب علمی کے اختتام پر یعنی ۱۹۱۷ء میں ختم ہوتا ہے۔

(ب)۔ ہارٹن کا زمانہ جس کا اختتام ۱۹۱۷ء میں ہوتا ہے جب کہ ملٹن نے یورپ کا سفر اختیار کیا۔

(ج) ۱۹۱۷ء سے ۱۹۱۷ء تک ملٹن نے مختلف موضوعات پر نثری مضامین اور کتابیں لکھیں۔

(د) بعد کی نظموں یا اظہارِ کمال کا زمانہ۔

جامعاتی تعلیم کے دوران میں ملٹن نے متعدد انگریزی اور لاطینی نظمیں لکھیں جو غیر اہم ہیں لیکن اس سلسلے میں

اُس قصیدہ کو استثنائی حیثیت حاصل ہے جس کا عنوان 'اود ڈ آل دی مارنگ آف کرائسٹینٹیٹیویٹی' رو لادت مسیح کی صحیح ہے۔ اسلوب کی ناہمواری اور بعض دوسرے معائب کے باوجود یہ نظم ایک نوعمر شاعر کے لئے یقیناً غیر معمولی کارنامہ ہے۔ ہارٹن کے قیام کے زمانہ میں اُس نے حسب ذیل تین نظمیں لکھیں جو اس قدر بلند پایہ ہیں کہ اگر پراڈس لاسٹ نہ لکھی جاتی تو بھی ملٹن کو انگریزی کے ممتاز ترین شاعروں کی اولین صف میں جگہ مل جاتی۔

L'Allegro

لالہ گرد

II Penseroso

ایل پینسیروسو

Lycidæ

لسیدس

یہ تین نظمیں بڑی لطیف اور دلچسپ ہیں، ان کا مطالعہ اگر اسی ترتیب سے کیا جائے جس میں وہ لکھی گئی ہیں تو ملٹن کے دماغی ارتقا کے مدارج واضح ہو جاتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ملٹن کی تحریروں میں تعشف کے سماجی اور اخلاقی اثرات کے ساتھ ساتھ نشاۃ ثانیہ کی وسعت نظر اور آزاد خیالی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اسی آمیزش نے اُس کے بہترین ادبی کارناموں میں پاکیزگی اور لطافت کی ایک نرالی شان پیدا کر دی ہے۔ ابتدائی نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملٹن کی شاعری کا آغاز نشاۃ ثانیہ کے علوم و حن کاری کے الہامی اثرات کے تحت ہوا۔ تعشف کا اثر پہلے پہل برے نام تمام جس میں روزِ رفتہ اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ آخر کار اپنے غیر معمولی تعفن اور گہرائی کی مدد سے اُس نے تمام دوسرے عناصر پر پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا۔ لالہ گرد میں انگلستان کے پُر فضا میدانوں اور مرغزاروں کے کشماکش سحری پیشے کے گئے ہیں۔ ہوا میں لطافت ہے، طیور، زمزمہ سنجی کر رہے ہیں۔ فضا کی جاں نوازی، فطرت کی دلکشی، راگوں کے ترنم اور خوشبوؤں کے تسطر کی وجہ سے شاعر کے حواس غم سے پر ایک بے خودی اور سرسستی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تنویر صبح کے فیض سے کائنات کی ہر ادا میں سحکی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اور پھولوں کے نکھار، شاخوں کے رقص اور طیور کے توج آفرین ترنم میں حیاتِ انسانی کے علامات نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں تعشف کی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ ملٹن نے سرخوشی اور سرشاری کے عالم میں رہنا ہی مسرتوں، دیہی کھیلوں، تعمیر کی نشاط انگیزیوں اور موسیقی اور عمارت سازی کے حسن اور رعنائیوں کے مرقعے نہایت موزوں اور دلکش الفاظ اور انداز میں پیش کئے ہیں۔

الپنیر و سومین انہیں مناظر کی شام کا بیان ہے۔ ہوا میں وہی طاوت اور نظر موجود ہے لیکن مسرت کی ولولہ انگیزیوں کی وہ شان اب خصت ہو چکی ہے لیکن اس کے اثرات ابھی باقی ہیں۔ انبساط کی موجوں کا تلاطم سکون سے بدل گیا ہے۔ خاموش فضاؤں پر بے خودی سی چھائی ہوئی ہے۔ مسرت کے پرجوش احساسات کی جگہ اب غور و فکر اور تفکر و تجسس نے لے لی ہے۔ تمام فضا میں جمالِ غم سے معمور ہیں۔ اس وقت کا سکوت باوجود اپنی ظاہری غم انگیزیوں کے دلربائی اور دلنوازی کی ایک نرالی شان لیے ہوئے ہے۔ شام کی بنائیں افق کی روشنی میں جگمگاتی نظر آتی ہیں۔ ایک نقاد کہتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں نظموں کے محاسن اور شعریت سے پورا پورا اطف اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی روز صبح میں لالہ گرد اور شام میں الپنیر و سو کا مطالعہ لیا جائے۔ کومس Comus میں ہم ملٹن کی شاعری کو ایک اور دور میں سے گزرتے ہوئے دیکھتے ہیں جن پر نقشب کے اخلاقی اثرات ستوی نظر آتے ہیں۔ ادبی نقطہ نظر سے کومس کا تعلق نشاۃ ثانیہ سے ہے اور قدیم ڈرامہ کی اس صنف کی جس کو نقابہ Masque کہتے ہیں یہ ایک نہایت مکمل اور جامع مثال ہے۔ نثرِ فاو در درباری حلقوں میں اس صنف کو ایک عرصت تک بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ لیکن متعسفین ڈرامہ اداکاری اور اسٹیج سے ہیشیہ منفرد ہے۔ اپنے ڈرامہ میں ملٹن نے مختلف اخلاقی رموز اور نکات کے حل کرنے کی مستقل کوشش کی ہے۔

ایک عورت کا جنگل میں رہستہ کم کروینا، کومس اور اس کے اوباش ساتھیوں کا فریب اور ایک موکل کی مدد سے اُن اوباشوں کے جنگل سے اس راہ گم کردہ عورت کی رہائی وغیرہ وغیرہ..... یہ ایک پرانی تخیل ہے جس کا مفہم نیکی اور نسی پرتی کی کشش اور غیبی امداد کے ذریعہ سے اول اندر کی کامیابی کا اظہار تھا۔

لیسیڈس Lycidas ایک شہابی مرثیہ ہے جو ملٹن نے اپنے کالج کے بہمن ایڈورڈ کنگ

کی موت پر لکھا تھا۔ اس کا طرزِ ادا اور اسلوب وہی ہے جو قدیم یونانی نظموں میں رائج تھا۔ گرجا کی ابتری اور پادریوں کی بدمنوئیوں کا ذکر ملٹن کے نقشب کا بین ثبوت ہے۔ ابتدائی نظموں سے اگر ایک طرف ملٹن کے مذہبی تخیلات کے ارتقا پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُس نے متعسفین کے فلسفہ حیات و اخلاق کی تشریح و توضیح کی تزیین کی خاطر نشاۃ ثانیہ کے علوم اور آرٹس سے کس حد تک استمداد کیا۔

نثری تحسیریں

یورپ سے انگلستان واپس ہونے کے بعد ملٹن نے اپنے آپ کو ملک کے سیاسی بکھڑوں میں اُبھادیا اور اس طرح خود اسی کے قول کے مطابق ایک ایسے پرشور بھری سفر پر روانہ ہوا جس میں ہر قدم پر طوفان خیز یوں اور شور انگیز یوں کا سامنا رہا۔ ایک طویل رزنیہ سم کھنے کا خیال ملٹن کے دل میں اس سے قبل ہی پیدا ہو چکا تھا لیکن ایک سوئی اور سکون کے فقدان کی وجہ سے اُس نے اپنی توجہ شکر کی طرف سے بالکل ہٹالی اور اُس دن بیس سال تک صرف نثر لکھتا رہا جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ ملٹن جیسے وجیدہ شعاع کی عمر کا ایک مفید حصہ سیاسی اور ملکی مسائل کے سنوارنے میں صرف ہوا تو ادب اور شاعری کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ ملٹن کے نثری کارنامے نہ تو آج ہمیں کچھ معلوم ہوتے ہیں اور نہ ان کے معاملہ سے کوئی خط حاصل ہوتا ہے گو بعض مقامات پر اس کے اسلوب میں لطافت اور سادگی بھی آگئی ہے۔ (خود ملٹن لکھتا ہے کہ نثر نویسی اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا جس میں سید سے ہاتھ کا کمال نہ تھا) اس کے طویل جملوں میں در پیچ ترکیبوں اور طرزِ ادا کی خصوصیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جدید نثر انگریزی کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ ان مقالوں میں صرف اریو پلٹنگ کا *Areofagetica* کو اہمیت حاصل ہے۔ ملٹن کے زمانے میں انگلستان میں ایک ایسا قانون نافذ تھا جس کے لحاظ سے کسی کتاب کی اشاعت اُس وقت تک نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ احتسابی کمیٹی اس کی اجازت نہ دے۔ محبت کو ادبیات کی لطافتوں سے زیادہ بادشاہوں اور پادریوں کے حفظ مراتب کا خیال رہتا تھا۔ بہترین کتابوں کی اشاعت صرف اس وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اربابِ اقتدار کو خوش کرنے سے قاصر تھیں۔ ملٹن نے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تقریر اور تحریر کی آزادی کی پرشوش حمایت کی بقول ہڈسن یہ مقالہ یقیناً اس قابل ہے کہ ذہنی آزاد اور ادبیات کے تمام پرستار اس کا معاملہ کریں۔

آخری دور کی شاعری

عظیم الشان نظم کے سرانجام کرنے کے خیال نے ملٹن کو ایک عرصہ سے بے چین کر رکھا تھا اس کی تکمیل کا موقع

اسی وقت مل سکا جبکہ عموماً شاہی نے اُسے تنہائی اور گناہی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ پیراڈائز لاسٹ (فردوسِ گم کردہ) انگریزی زبان کی باہمیت ترین نظم ہے اس نظم کا موضوع کوئی خاص شخص یا ہیرو نہیں بلکہ یہ نوع انسان کی داستان ہے۔ تخلیقی استعداد اور ذہنی اور دماغی قوت کے اس ہتھم باشان شہ کار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملٹن کے کمال کے دو عناصر تھے یعنی تعشق اور نشاۃ ثانیہ کے اثرات۔ اس نظم کا موضوع اور وجدان دونوں ملٹن کے تعشق کی پیداوار ہیں اس نے پیراڈائز لاسٹ کے ذریعہ سے اپنے دینی مقصدات کا اظہار کیا اور انہیں کو بنیاد قرار دیکر بندوں کے ساتھ خدا کے سلوک اور ابدی الوہیت کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اگر ایک مفکر اور معلم اخلاق کی حیثیت سے ملٹن کا تعلق متعقبنین سے تھا تو ایک حسن کاری کی حیثیت سے وہ نشاۃ ثانیہ کا زبردست ترجمان بھی تھا مضمون کی ترتیب اسلوب اور طرزِ ادا ان تمام چیزوں میں زمانہ قدیم کی ممتاز ترین رزمیہ نظموں کی شان پائی جاتی ہے جن کو ملٹن نے اپنے لئے نمونہ قرار دیا تھا۔ اس نظم میں جو وسیع اور وسیطہ معلومات پیش کی گئی ہیں اُن پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ تنہائی اور بے بصری کے زمانے میں ملٹن نے اپنی ادب لے سرت بخش مطالعہ سے کس حد تک استفادہ کیا تھا۔ اسی اور راست کاری اور اخلاقی تعلیم کی اہمیت پر جا بجا زور دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ علوم کی محبت اور آرٹ اور جمالیات کی پرستاری کے جذبات بھی اس نظم سے ظاہر ہوتے ہیں۔ دینیاتی موضوع اختیار کر کے ملٹن نے ایک ایسی ہتھم باشان زرمیرہ نظم پیش کی ہے جس کی نظیر دنیا کے جدید ادب میں نہیں مل سکتی۔

پیراڈائز لاسٹ

پیراڈائز لاسٹ میں خدا کے خلاف شیطان کی بغاوت، جنت کی جنگ، باغی فرشتوں کی پساہی انسان اور کائنات کی تخلیق آدم و حوا کی آزمائش اور اُن کے جہنم سے نکلے جانے کا بیان ہے جنت کے پُر فضا مناظر اور رو و رخ کی رحمت نایوں کے بہترین مرقع پیش کئے گئے ہیں۔ ہیرو یعنی آدم کا کردار اس قدر شاندار نہیں تھا کہ شیطان کا ملٹن کا اہل مقصد تعقیقت کا اظہار تھا کہ کس طرح انسان کی پہلی نافرمانی نے گناہ اور موت کو اپنے جلوس میں لیا۔ لیکن اپنی عادت کے مطابق اس نے اپنی نظم کو بڑی کفیح پر ختم نہیں کیا۔ بلکہ ایک عالم غیب کی طرح نجات کی بشارت پر ختم کیا ہے۔

یہ مضمون کہتا ہے کہ پیراڈائز لاسٹ ایک ایسے متعشق کا خواب ہے جو خجیل پڑھتے پڑھتے سو گیا ہو حقیقت یہ ہے کہ

انظہم کی دلچسپی کا انحصار زیادہ تر نخیل سے اخذ کردہ مواد پر نہیں بلکہ ان تھخیز خیز معرکوں پر ہے جو ملٹن کو خواب میں نظر آئے۔
خاص ادبی کردار کی حیثیت سے ملٹن کے خدا میں بھی دو توشفت کی تنگ خیالی اور کٹر پین پایا جاتا ہے وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے اجزائے ترکیبی میں بلا کی انانیت پائی جاتی ہے اور بجائے خادم کائنات کے وہ ایک حاکم جابر معلوم ہوتا ہے جس کے تخت کے چاروں طرف خوشامدی فرشتے ہمیشہ تعلق اور چا پلوسی میں مصروف رہتے ہیں۔ ولیم لانگ کہتا ہے کہ ایسے کردار کی تلاش آسمانوں میں کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نوع دُنیا میں بہت عام ہے۔

برخلاف اس کے شیطان کا کردار دیکھتے وقت ملٹن کا خیال کسی قید و بند کا پابند نہیں رہا اور اس نے ایک ایسا کردار پیش کیا جو جرات، آزادی اور خودداری کی وجہ سے لائق تحسین ہے۔

”کیلہ ہی وہ مقام ہی وہ سرزمین اور وہ علاقہ ہے“

موزول معلم الملکوت نے کہا۔ ”یہی جگہ ہمیں جنت کی بجائے ملی ہے؟“

یہ نعم انجینئر تاریکی، اس آسمان نور کی جگہ.....

غیر پرواہ نہیں۔ چونکہ جو ہستی اصل میں ہمارے مساوی حیثیت رکھتی ہے وہ قوت اور جبر کی مدد سے ہم پر نگرانی کر رہی ہے، اس سے جس قدر بڑی دوری رہے بہتر ہے۔

اے مسرت و وام بخشنے والے مرغزار و الاداع، اے دوزخ کی ہون کیو خوش آمدید۔ اے بہنم اپنے جسید ملک کا استقبال کرو جس کے عزم کو زمان و مکان کا کوئی انقلاب متزلزل نہیں کر سکتا۔

دل بجائے خود ایک دنیا ہے۔ وہ

اپنے لئے جنت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت میں منتقل کر سکتا ہے۔

یہاں ہم مزے سے حکومت کر سکیں گے اور میری رائے میں حکومت ایک آرزو کئے جانے کے قابل چیز ہے چاہے

وہ دوزخ ہی میں کیوں نہ ہو۔ دوزخ کی حکومت جنت کی غلامی سے کہیں بہتر ہے۔

کے مساوی

Divina Comedia

ملٹن کی یظلم ڈانٹے کی ڈی۔ اے۔ این کامیڈی

درجہ رکھتی ہے۔

یظلم کا اہل خاکہ مکمل ہو چکا تھا لیکن ملٹن کے دوست ٹامس الیوڈ Ellwood نے ایک روز پوچھا "لیکن تو فردوس باز یافتہ سے متعلق کیا بیان کر سکتا ہے؟" اسی سوال کے جواب میں ملٹن نے پیراڈائز لاسٹ کا دوسرا حصہ لکھا جو پیراڈائز ریگینڈ Paradise Regained کے نام سے مشہور ہے اور جس میں مسیح کی آزمائش کا ذکر ہے۔ پیراڈائز ریگینڈ کے بعض حصوں کا اسلوب یقیناً دلچسپ اور بلند آہنگ ہے لیکن دور جدید کے اکثر تنقید نگار اس امر پر متفق ہیں کہ اس نظم کی خوبیاں اس کے مہتمم با نشان پیش رو کی تابناکیوں کی وجہ سے ماند ہو گئی ہیں۔ اس دوہلی آخری یادگار ایک ڈرامائی نظم میسن ایگونیٹیز ہے۔ پیراڈائز لاسٹ کی طرح اس نظم میں بھی ملٹن نے تخیل کے ایک موضوع کو قدیم آرٹ کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کی ترتیب اور تشکیل میں یونانی حزنیہ کا پورا پورا تاج پایا جاتا ہے جس زمانہ میں ملٹن کو رنڈیظلم لکھنے کے لئے موضوع کی تلاش تھی۔ اس کے ذہن میں میسن کا قصہ آیا لیکن اس نے فنرل انسانی کی داستان کو اس پر ترجیح دی پھر اس موضوع کی طرف غالباً اس وجہ سے توجہ کی کہ میسن بھی ملٹن کی طرح دشمنوں سے گھبرا ہوا اور مغموم بنا بیٹا تھا۔

ملٹن کی شاعری کی خصوصیتیں

شکسپیر کے بعد ملٹن کو انگریزی شاعروں میں سب سے زیادہ عظمت و امتیاز حاصل ہے یعنی ڈرامہ کے استثنیٰ کے ساتھ وہ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر ہے اس کے علاوہ تمام نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ ملٹن کا شمار دنیا کے تین یا چار با عظمت ترین شاعروں میں ہے شکسپیر، جڈباتی شاعر تھا اور ملٹن نصب یعنی۔ فرانسجبلک کی طرح اس کا بھی خیال تھا کہ نصب یعنی ادب کی تخلیق کی سب سے پہلے ضروری ہے کہ لکھنے والا اپنے آپ کو انسانی نصب یعنی انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقام تک پہنچادے۔ ملٹن جیات انسانی کی جملہ لطافتوں سے آگاہ اور لطف اندوز ہونے کا متمنی تھا۔ اس لئے اس نے اپنے

دن موسیقی حسن کاری اور ادبیات کے مطالعہ میں اور رہن عمیق تحقیقات اور مراقبہ میں بسر کریں۔ علیٰ ماحول میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اسلوب میں نعمت اور بلند پروازی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ ملٹن کی ہستی اعلیٰ ترین ذہنی و مافی اور تخلیقی کمالات کی جامع تھی وہ ایک ماہر فن معصوم تھا جس کو تصویر کی جزئیات اور مجموعی کیفیت کا نقش کھینچنے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس کی تحریروں کی ممتاز خصوصیت بلند آہنگی نعمت ادا اور پر شکوہ الفاظ ہیں جس کو ملٹن تک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی تحریروں میں نعمت خیال اور شوکتِ الفاظ کو قائم رکھنے میں ملٹن کو خدا دادِ ملکہ حاصل تھا۔ اس کی واقعہ نگاری کی استعداد بھی حیرت انگیز تھی جس کا ثبوت مختلف مثالوں سے ملتا ہے مثلاً پیراڈائز لاسٹ کا وہ ابتدائی حصہ جس میں جہنم کے مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ ملٹن ڈرامائی قابلیت سے بڑی حد تک محروم تھا لیکن معزول فرشتوں کی روداد اور حوا کے امتحان کی پوری داستان سے جہلت اور کردار نگاری سے متعلق اس کی باریک بینی اور محققانہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ پیراڈائز لاسٹ شروع سے آخر تک انسانی اسپرٹ سے ملبو ہے۔ ملٹن کی تحریروں میں ایک گہری انفرادیت پائی جاتی ہے جو حد درجہ اثر انگیز ہے۔ نعمت خیال اور اخلاقی خلوص کی وجہ سے ملٹن کے مطالعہ کے وقت ہم اپنے آپ کو ایک ایسی ہستی کے حضور میں پاتے ہیں جس کی روح ایک ستارے کے مانند دنیوی ملاحظے سے بلند و بالا تھی۔“



رابندرانا تھٹیکور کی ادبی زندگی کا آغاز

۱۸۶۱ء

مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے۔ عثمانیہ معتد بزم اردو

رابندرانا تھٹیکور جس گھر میں پیدا ہوئے وہ مذہب اور فنون لطیفہ کا گوارہ تھا اور جس فضا میں آنکھ کھولی وہ یکسر شعر و موسیقیت کی فضا تھی جہاں صلاحتیوں کو اس ماحول میں پرورش پانے کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ تھٹیکور نے آٹھ سال کی عمری سے شعر کہنا شروع کیا۔

ایک نیلی بیاض ہمیشہ ساتھ رہتی تھی جو شعر یا نظم موزوں ہوتی اُسے فوراً نقل کر لیا کرتے تھے شدہ شدہ ساتھیوں استادوں اور گھروالوں کو معلوم ہو گیا کہ رابی زچپن میں انہیں پیار سے رابی کہا جاتا تھا شعر کہتا ہے۔ سب سے پہلی نظم جہانوں نے لکھی وہ ”کنول“ پر ہے۔ ان کے بڑے بھائی خوشی اور فخر کے ساتھ سب سے ٹیکور کا حیثیت شاعر تعارف کراتے خوش سمانی کے ساتھ اُسے پڑھتے، سننے والے سب تعریف کرتے اور فخریز شاعر کی ہمت بڑھاتے۔

گویندا بابو نے جو ٹیکور کے استادا تھے اور جو انہیں بہت چاہتے تھے ایک دن پوچھا تو تم شعر بھی کہتے ہو؟
شاعر نے بنیرس و پیش کے مدہاں کہا۔ اس پر مہربان استاد نے ایک اخلاقی نظم لکھنے کی فرمائش کی جب انہوں نے نظم لکھی تو بابو نے اعلیٰ جماعت کے لڑکوں کے سامنے شاعر کو بلا کر نظم سنانے کے لئے کہا۔ جب ٹیکور نے نظم سنانی تو کسی نے یقین نہیں کیا کہ اتنی اچھی نظم اس بچے نے لکھی ہے۔ بعض لڑکوں نے بل کر یہ بھی کہا ”یہ نظم جہاں سے نقل کی گئی ہے ہم بچا کرتے“

گر جب ثبوت طلب کیا گیا تو سب بغلیں جھانگنے لگے۔

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ ماگھ کے تہوار کے موقع پر جو مناجاتیں گائی گئیں انہیں سے اکثر ٹیگور ہی کی لکھی ہوئی تھیں۔ ایک مناجات کا مندرجہ ذیل ہے۔ ”آنکھ جھکو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ جو ہر ایک کے آنکھ کی پتلی ہے“ اس پر ٹیگور کے والد نے کہا اگر ملک کا بادشاہ اس شاعر کی زبان اور ادب کو جانتا تو ضرور انعام دیتا۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے میں یہ حدت انجام دوں گا۔ یہ کہہ کر ایک چک نہنے شاعر کے حوالہ کیا۔

(۸۱ - ۱۸۶۵)

(عمر ۳۴ سال)

اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ٹیگور کی شاعرانہ اور ادبیانہ کوششیں مکان کے محدود حلقہ سے گزر کر منظر عام پر آجائیں۔ ”گیانا نگر“ ایک ماہوار رسالہ ان کی تمام نظموں کو شائع کرنے لگا۔ ایک تنقیدی اور کسی قدر تاریخی مضمون نے بھی نہیں جگہ پائی۔ اس وقت عمر ۳۴ سال تھی۔

ان کے بڑے بھائی جو نند راما نند نے ایک ماہوار رسالہ ”بھارتی“ نکالنا شروع کیا تھا۔ ٹیگور بھی مجلسِ ادارت کے شریک بنائے گئے۔ یہ رسالہ ان کی نظموں کے اظہار کا واسطہ بن گیا۔ اس دور کو ہم بھارتی کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی ایک طویل نظم کوئی ہمانی (سرگزشتِ شاعر) بھارتی ہی میں نمودار ہوئی۔ یہ اس عمر کا نتیجہ فکر ہے جبکہ لکھنے والا گرم و سرد زمانہ کا کچھ بھی تجربہ نہ رکھتا تھا۔ ان کا یہ پہلا ادبی کارنامہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔

بھنوں سنگہ

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں ان کے زیر مطالعہ و شنو اشاعروں کا کلام زیادہ رہا ہے۔ اس لئے ابتدائی کلام بالکل چندی دہس اور ودائی بنی کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ انہوں نے بھنوں سنگہ کے فرضی نام سے چند نظیں لکھیں۔ یہ زبان اسلوب و خیالات کے لحاظ سے اتنے پاکیزہ اور ایسا قدامت کا رنگ لئے ہوئے تھیں کہ بالکل و شنو اشاعروں کا کلام معلوم ہوتا تھا۔

جو سننا بے ساختہ داد و تیا جب زیادہ شہرت ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ان نظموں کا لکھنے والا بھنوسنگ نہیں یہ خود ہیں گوسی نے یقین نہیں کیا۔ غرض ایک عرصہ تک یہ اپنے ہم وطنوں کو بوقیوف بنائے رکھے۔ یہ غلط فہمی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ نیگور اس ضمن میں شہی گزنا چترجی کا واقعہ بڑی دلچسپی سے بیان کرتے ہیں۔

صاحب موصوف کو جرنی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری اس کارنامہ کے صلہ میں دی کہ انھوں نے بنگالی اور اور پورپی شاعری کا Cyrie کا تقابلی مطالعہ کر کے مقالہ پیش کیا تھا جس میں بھنوسنگ کو بنگال کے ایک قدیم شاعر کی حیثیت سے بڑی عزت دی گئی تھی۔ حالانکہ بھنوسنگ نیگور ہی کا ایک فرضی نام تھا۔

لندن کا سفر (۱۸۷۷)

ان کے بھائی احمد آباد کے جج تھے۔ ان کی بیوی بچے لندن میں مقیم تھے۔ رابندر اناتھ چند ہی نے احمد آباد میں ٹھہر کر۔ اکتوبر کو اپنے بھائی کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔

وہاں کی دنیا ان کے لئے بالکل نئی تھی۔ اپنی گھریلو زندگی سے وہ ایک دم ایسی دنیا میں پہنچ گئے جہاں کے بسنے والے زبان رنگ اور آداب و طرز معاشرت میں ان سے بالکل مختلف تھے۔ اس سفر کا مقصد بیمار سٹری کا متحان پاس کرنا تھا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قیام لندن کے زمانہ میں اور مدرسوں کے علاوہ نیورسٹی کالج میں انگریزی ادب کی تعلیم پا کر انگریزی ادب سے متاثر ہوتے رہے۔ ایک سال کے بعد پھر ہندوستان واپس آئے یہ سفر ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی وقفہ نہیں پیدا کیا۔ بلکہ مشغولیتیں آنے تک برابر جاری رہیں۔ نظم سے زیادہ نثری کارنامہ اس دور کا زیادہ قابلِ سزا ہے۔ دوران اور قیام سفر میں انھوں نے ایک سلسلہ خطوط کا لکھنا شروع کیا جو مسلسل بھارتی میں شائع ہوتے رہے۔ خط نویسی میں ان کو اچھا ملکہ ہے۔ ان کے خطوط ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ ”دل شکستہ“ کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کی ابتدا ابتدا سفر ہی سے ہو چکی تھی مگر ہندوستان میں آکر اس کی تکمیل ہوئی۔ بھارتی میں نمودار ہوئی۔ اور بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم اور اپنے اس دور پر شاعر خود تیس سال بعد ان الفاظ میں تنقید کرتا ہے۔ ”جب میں نے دل شکستہ“ لکھنا شروع کیا میں اٹھارہ برس کا تھا۔ جبکہ میں نہ پورا جوان تھا اور نہ پورا بچہ

یہ عرصہ صداقت کی راست شعاعوں سے منور نہیں ہوتی بلکہ اس کی بھٹکیاں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہیں۔ اور باقی سب ساتھ ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت کے سایہ کی طرح اس کے تصورات و راز اور مہموم ہیں جو حقیقی دنیا کو دہم میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس زمانہ کا دلچسپ حصہ یہ ہے کہ نہ صرف میں بلکہ اس پاس کے ہر شخص کو مجھ جیسا اٹھارہ سالہ سمجھتا تھا۔ اور ہم سب بے بنیاد اور غیر موجود تخیلی دنیا کی طرف جا رہے تھے جہاں کہ بہت ہی شدید مسرت اور غم بھی ایک خواب کی دنیا کی مسرت اور غم معلوم ہوتا تھا۔ میری عمر کا ۱۵ یا ۱۶ سے ۲۲ یا ۲۳ سال کا زمانہ بالکل غیر منتظم زمانہ ہے۔“

صبح کے گیت اور شام کے گیت

جب اپنے نفس اور خارجی دنیا میں عدم مطابقت ہوتی ہے تو انسان دل میں ایک درد محسوس کرتا ہے۔ الفاظ سے زیادہ آہ اور چیخ ہی اس سوزِ نہانی کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ شاعر ٹیگور اب شباب کے جس دور سے گزر رہے تھے وہ سن کے لحاظ سے کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھا۔ شام کے گیت اور ”صبح کے گیت“ اس دور کے مختلف نظموں کے مجموعے ہیں جو شاعر کے قلبی کیفیات کی مداہم خیزیوں کا اچھا مرقعہ ہیں۔

شام کے گیت کے عنوانات ہی اس کا پتہ دیتے ہیں کہ شاعر کے دل میں کتنا درد اور حزن بھرا ہوا ہے۔ ”ناامیدی امید“ ”ایک ستارے کی خودکشی“ ”دعوتِ حزن“ ”بے دل کی عورت“ ”دل کا مرثیہ“ اب ان کے کلام میں انفرادیت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے انقلابی اور جدید رومانٹی شاعر کی حیثیت سے ان کا وقار قائم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر سیل جو بڑے نقاد ہیں ان نظموں کے متعلق لکھتے ہیں ”یہ نظمیں موضوع اور جذبات کی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستانی شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔“

ساتھ ہی ساتھ یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ان کی شاعری کی تعبیر کا بالکل ابتدائی زمانہ ہونے کی وجہ سے باوجود اپنے محاسن کے یہ نظمیں ستم سے بالکل خالی نہیں ہیں۔ بحیثیت مجموعی کلام میں تنوع کا فقدان اور

تکرار خیال Monotony of Thought کی زیادتی نمایاں بتلائی جاتی ہے۔

دو موسیقیانہ طریقے (میوزیکل کامیڈیٹیز) (۱) جوہر دایسکی (دی جنس آف وایسکی) (۲) خطرناک

شکار (دی قیث فل ہنٹ) اس قومی کیفیت کو توڑتے ہیں

جوہر دالمیکی۔ اس ڈرامہ کا پلاٹ دالمیکی کے قصہ سے لیا گیا ہے۔ دالمیکی پہلے ایک ڈاکو تھا۔ سارس کے جوڑے کے دردناک واقعہ سے متاثر ہو کر موزوں الفاظ میں اس نے نوحہ لکھا۔ سارس کا واقعہ یہ تھا کہ کسی شکاری نے سارس کے ساتھی کو مار دیا تھا اور وہ اکیلی تھی۔ دالمیکی نے رامانہ بھی اسی بحر میں لکھی ہے ان کے یوتز جانے سے پہلے گھر میں عموماً ایسی مجلس ہوتی تھیں جہاں با مذاق لوگ جمع ہو کرتے تھے اور جہانوں کی سخا اور دوسری مفرحات سے ضیافت کی جاتی تھی۔ جب یہ یورپ سے واپس آئے تو ایک ایسی ہی آخری مجلس منعقد ہوئی اس موقع کے لئے یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ دالمیکی کا پارٹ خود ڈاکٹر ٹنگور نے ادا کیا۔ اور ان کی بھتیجی نے سرسوتی کا کام کیا تھا۔

گو اس ڈرامہ میں بعض نظمیہ واقعی شاعرانہ خوبیاں رکھتی ہیں مگر پورے کا پورا ڈرامہ محض وقتیہ اثر پیدا کرنے والا ہے جس میں محض موسیقی کی خاطر الفاظ جڑ دیئے گئے ہیں۔ اس کو تو اسٹیج پر دیکھنے اور سننے ہی میں مزا آتا ہے۔ یوں پڑھیں تو کچھ زیادہ لطف نہ آئیگا۔ اس ڈرامہ میں کچھ نظمیہ اکشیا یا بوکی بھی ہیں۔ اور کچھ وہاری لال چکرورتی کے سارہ مشکل سے مانو ذہیں۔

پہلے ڈرامہ کی کامیابی نے انھیں دوسرا ڈرامہ لکھنے کی ہمت بند بائی "خطرناک شکار" اس ڈرامہ میں دوسرے کے ہاتھوں سادھو کے بیٹے کے قتل کا قصہ ہے۔ جب اسٹیج کیا گیا تو پبلک بہت متاثر ہوئی۔

موسیقی را بندرانا تھ کی رگ و پے میں سراوت کے ہوئے ہے۔ نئے نئے راگ بنانے اور ان کو لفظی جاہ پہنانے میں خاص ہمارت حاصل ہے۔ جس کا مظاہرہ ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ پھر یہ ڈرامے اس وقت لکھے گئے جب کہ گھر میں موسیقی کے چشمے ابل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے موسیقی کے کوئی اور مشغلہ نہیں تھا یہی اسباب تھے جس کی وجہ سے دو موسیقانہ طریقے پیدا ہوئے جس میں موسیقی کے کمالات کا خوب اظہار ہوا ہے۔

ان ڈراموں میں اترستانی شاعر ٹامس مور کا اثر بتلایا جاتا ہے۔ غالباً ان ڈراموں کے لکھنے کے محرک بھی آئرش میلوڈیز ہی ہیں۔ کیونکہ انگلستان جانے سے پہلے کشیا یا بوکی صحبت میں آئرش میلوڈیز کی مصور جلد

پڑھنے کا انہیں اتفاق ہوا تھا جس نے شاعر کے دماغ پر قدیم آئرستانی تہذیب کا ایک موہوم ساقش جما دیا۔ آئرستانی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش شدت کے ساتھ ان کے دل میں جگہ پا گئی تھی جب یہ ولایت گئے تو یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔ اور کئی راگ بھی سیکھے۔ ان طربوں میں انہیں راگوں کو داخل کیا گیا ہے۔ ہندستانی اور آئرستانی راگوں کے امتزاج سے ایک نئی کیفیت پیدا کی جس کی ان سے پہلے کسی نے ہمت نہیں کی۔

اس کے بعد ہی صبح کے گیت آتے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت ہی بلند تفکر اور نئی نئی خیالات کی حامی ہیں۔ اس مجموعہ میں نظموں کے بعض عنوانات یہ ہیں۔ ”کائنات کا خواب“ ”زندگی کی سرمدیت“ ”فطرت سے اتحاد“ اپنے خواب سے جاگا ہوا فوارہ“ ”نغمہ۔ محبت۔ زندگی“ اس آخری نظم کی نسبت ڈاکٹر سیل کہتے ہیں کہ اپنی فصاحت کے اعتبار سے گونے کی تھری روس سے کچھ ہی کم ہے۔ یہ نظمیں بندش کی چستی اور اسلوب کی روانی میں اپنی پیش رو نظموں کے مقابلہ میں امتیازی برتری رکھتی ہیں اور شاعر کے آئندہ رجحانات کا پتہ لگانے میں مدد دیتی ہیں یہ دوران کی ادبی زندگی کا دیباچہ تھا جو ان نظموں پر ختم ہوا۔

نواب شمس الامراء بہادر کے علمی کارنامے

(انس)

نواب محمد ظہیر الدین خاں بہادر بی۔ اے (عثمانیہ)

اس مضمون کے شروع کرنے سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خاندان پائے گاہ کے کئی بزرگ شمس الامراء کے خطاب سے ممتاز رہے ہیں۔ ابو الفتح خان بہادر تیغ جنگ شمس الامراء اول کے صاحبزادے، محمد فخر الدین خاں بہادر شمس الامراء ثانی سب سے پہلے ایسے پائے گاہ ہیں جن کی علم دوستی و علم پروری آج تک مشہور ہے۔ یہ اپنے والد کی وفات کے وقت گیا رہ سال کے بچے ہی تھے، لیکن اپنی مادر ہربان کے زیر تربیت جس طرح خاندانی سپاہ گری کے فنون میں کمال حاصل کیا تھا، اسی طرح ذوق علم و فضل میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

ان کے زمانہ حیات کے ایک مشہور مصنف، خواجہ غلام حسین خاں، مخاطب بہ خان زماں نے اپنی تاریخ ”گلزار اصفیہ“ میں ان کی علمی فضیلت کے متعلق اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

”ان رخیل امراءے نامدار امیر سیت صاحب شان و شوکت و شکوہ، ابنوہ جاہ و حشمت قدر دان

کمال و جویاے اہل کمال، رفیق پرور ستودہ خصمال، نجیب شناس، صاحب نصایف علوم حکمت، علی انحصوس در علم ریاضی کہ عبارت از ہندسہ و ہیت باشد، و نیز در علم جبر تخیل رسالہ اے عمدہ تصنیف فرمودہ سنہ شمسیہ کہ مشہور آفاقا

دنیسا لٹریچر ریاضی را آن قدر سہل و آسان تر نمود کہ خلقے در اندک توجہ و شوق بحصول مقاصد و مطالب بلند و آراہ
دل پسند ارجنڈ می رسد اگر بوعلی سینا زندہ می بود، و ادا این تحریر دل فرامی داد و نیز در علم حساب رسالہ خلاصہ بہ
تخریر تصنیف آورد کہ آن علم لطیف، خلاصہ تر شدہ بہ فہم و ادراک ہر ذی فہم می آید۔ اگر شیخ بہاؤ الدین عالمی می دید بصید
دل و جان پشیمانے بے پایاں لب انصاف می کشاد۔

مہذا مدرسہ ہائے متعدد در بلدہ حیدرآباد، باشا و ان کامل علوم، مقرر فرمودہ کہ طفلان غربا بے شمار شبانہ
روز بہ تحصیل علوم نقلی و عقلی مشغول و مصروف اند۔ این سعادت کبریٰ و مہمبت عظمیٰ در بیچ خدی سلف، بادشاہان قطبیہ
تا این زمان حصہ ہمیں قدر دان بود کہ یہ ظہور آمد۔ و تا قیام روزگار مشہور خواهد بود، و برائے خوشنودی طفلان، و توجہ شوق
ایشان، دو دور پیہ ماہور میسور خوری بہ ہر ہر طفل می دہند۔ چنانچہ ہر ہر طفل سرراپا شوق داشتہ از علم فہمی خیر دار عفا
و مسائل عبادات گردیدہ است، و محبت سرور بہ استاد خویش مشغول نماز پنج گانہ صیام ماہ رمضان المبارک ہستند۔

یہی وہ شمس الامراء ہیں جنہوں نے، حکمت، ہندسہ، ریاضی، وغیرہ کی کتابیں سب سے پہلی دفعہ اردو میں
لکھوائیں، اور خود تصنیف کیں۔ ان کے فرزندوں میں ایک محمد رفیع الدین خاں عمدۃ الملک تھے اور دوسرے محمد
رشید الدین خاں اقتدار الملک اول الذکر شمس الامراء ثالث اور موخر الذکر شمس الامراء رابع "سمجھے جاتے ہیں تیسرے
فرزند محمد بدر الدین خاں بہادر تیسرے معظم الملک تھے، جو عنفوان شباب ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کی نسبت، ان کی کم عمری
ہی میں مصنف گلزار اصغیہ نے لکھا تھا کہ "اگر فضائل علی از حکمت و ریاضی وغیرہ بہ ارقام آرد، و فترے پائیاں یا یاد
ہمارے اس مضمون کا تعلق ان ہی متذکرہ چار اراکین خاندان پائے گاہ سے ہے۔ اول الذکر یعنی ذاب
نور الدین خاں شمس الامراء ثانی خود بہت بڑے مصنف اور زبان اردو کے محسن تھے۔ ان کی مصنفہ کتابیں اس وقت
تک موجود ہیں۔ انہوں نے خود کام کرنے کے علاوہ اپنے ملازمین اور مصاحبین سے بھی کئی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائیں

جن میں سے فی الحال حسب ذیل اس وقت تک دست یاب ہوئی ہیں

(۱) ستہ شمسیہ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کی (۶) جلدیں ہیں ان کا دیباچہ (جو خود نواب محمد فخر الدین کا بہادر کا لکھا ہوا ہے) ظاہر کرتا ہے کہ ان کو جدید ترین علوم و فنون سے کسی دیکھی تھی چنانچہ انہوں نے ان رسالوں کے مجموعہ کو یورپ کی زبانوں کی کئی کتابیں منگوا کر اور اپنے زیر نگرانی اپنے ہی ملازمین سے اردو میں مرتب کرایا جس کے متعلق وہ کہتے ہیں :-

”بندہ نیازمند درگاہ ایزدی کا، محمد فخر الدین خاں المصطفیٰ شمس الامراء، اس طور پر گزارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں بسبب میلانِ طبیعت کے کہ بہت اس طرف شوق رکھتا تھا میری سماعت میں آئیں اس جهت سے چند مسائل ان کے از بر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبانِ عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں چنانچہ علمِ تجزیہ ثقیل اور علمِ انظار وغیرہ مگر اس قدر نہیں ہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور برہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعضے علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا چنانچہ علمِ آب، اور ہوا، اور برتک، اور متفانیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ ہندیوں کے فائدے کے لئے کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبانِ فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصتِ قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے کس واسطے کہ اگر بڑی بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا، اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی، پھر طالبین از خود ارادہ بسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے۔“

اور اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :-

”حکم کرنے میں آیا کہ ان علوم مذکور کو زبانِ انگریزی سے اردو زبان میں ہمارے رُو برو ترجمہ کریں چنانچہ بفضلِ حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے۔ مگر بعضے اسمائے انگریزی اصطلاح کے جو زبانِ عربی اور فارسی میں نہ میسر ہو سکے ان کو اسی زبانِ اصلی پر بحال رکھنے میں آیا، اور یہ چھ رسالے جو ترجمہ کئے گئے، کچھ مشتمل ہیں اس واسطے نام ان کا ”ستہ شمسیہ“ رکھا گیا۔ مگر مناسب جان کے علمِ متفانیس کو علمِ انظار کی جلد سے علیحدہ کر کے آخر میں جلد برتک کے

شریک کیا گیا اور ماہہ تاریخ اس رسالے کا گزرا نا ہوا حافظ مولوی سید الدین فیض کا یہ ہے۔

”تالیف نواب شمس الامراء“

(۲) ان چھ کتابوں کے علاوہ فی الحال گیارہ اردو کتابیں ہیں اور ملی ہیں جو نواب صاحب معز کے حسبِ حکم یا ان کی سرپرستی میں یا ان کی اس علمی دلچسپی کے باعث لکھی گئی ہیں اور ان ہی کے چھاپے خانے میں حسبِ تفصیل ذیل چھپ کر شائع بھی ہوئیں۔ چنانچہ

(۱) ۱۲۵۱ء میں ایک رسالہ ”موتی کے چونکالنے“ کے متعلق طبع ہوا

(۲) و (۳) ۱۲۵۲ء میں رسالہ ”مختصر جرنیٹیل اور رسالہ ”اصولِ علم حساب“ کی طباعت عمل میں آئی۔

(۴) ۱۲۵۳ء میں ”رسالہ کسور اتہ اعشاریہ“ چھپا۔

(۵) ۱۲۵۵ء میں رسالہ ”اسطرابِ کروئی“ مطبوع ہوا۔

(۶) ۱۲۵۹ء میں ”علمِ کیمسٹری“ کا رسالہ حلیہ طبع پایا۔

(۷) ۱۲۶۱ء میں رسالہ ”منتاح الافلاک جوصل میں بادشاہِ اودھ“ نصیر الدین حیدر کے حکم سے

لکھا اور چھاپا گیا تھا اور جس کی چند جلدیں نواب صاحب موصوف نے خرید فرما کر اس فن کے متعلمین کو تقسیم کی تھیں۔ اسی رسالہ کو اور اس کے اشکال کو ان خواہشمندوں کی سربراہی کے لئے علیحدہ علیحدہ جلدوں میں خود اپنے سنگی چھاپے خانے میں چھپوا کر تقسیم فرمایا۔

(۸) و (۹) ۱۲۶۱ء میں ”فضل الآدابِ صغیہ“ اور ”رسالہ کیمسٹری“ نے طباعت کا جامہ پہنا۔

(۱۰) ۱۲۶۲ء میں ”رسالہ مختصر حیوانات مطلق“ چھاپا گیا۔

(۱۱) ۱۲۶۶ء میں ترجمہ ”مرقع تصویرات حیوانات“ نے مطبوعہ صورت اختیار کی۔

(۱۲) نواب فخر الدین خاں بہادر کو ”علوم و فنون کے علاوہ“ شعر و شاعری سے بھی بڑی دلچسپی تھی چنانچہ

دکن کے شاعروں کے علاوہ شمالی ہند کے شعراء بھی آپ کی قدر دانیوں سے مالا مال ہوتے رہے۔ آفاق اور شہرت تو آپ کے یہاں ملازم ہی تھے۔ اور بہر تقریب یا عیدین میں قصیدے وغیرہ پیش کر کے انعامات سے سرفراز ہوتے

تھے۔ ان کا کلام اور شاعرانہ نکتہ سنجیاں اور خوش بیانیاں، قلمی مغلطات کی صورت میں ہمارے کتب خانہ میں اب تک محفوظ ہیں۔

حیدرآباد کے شعراء میں مولوی حافظ شمس الدین محمد فیض کو خاص قدر و منزلت حاصل تھی۔ چنانچہ ان کی کئی تاریخیں خود شمس الامراء بہادر کی اکثر کتابوں میں اور دوسرے ارکین خاندان کی مایینفات پر بھی موجود ہیں۔ ان کا ایک اردو، خاق باری کے طرز کار سالہ ”فیض جاری“ بھی اسی مطبع سے ۱۳۱۰ھ میں چھپا، جو نواب صاحب ہی کے حکم سے لکھا گیا تھا۔

(۳) آخر میں نواب فخر الدین خاں بہادر کی خود ذاتی تصانیف کا ذکر ضروری ہے، مگر افسوس ہے کہ ان کی اردو کتابوں کی نسبت یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ان ہی کی ہیں۔ اس لئے کہ دیباچہ میں بجائے اپنا نام لکھنے کے صرف یہ لکھ دیا ہے کہ ”مصنف اس کتاب کا یہ کہتا ہے“۔ البتہ فارسی کتابوں میں اس کی اکثر تصانیف وضاحت کی ہے مثلاً کتاب ”شمس الہند“ جو سلسلہ میں چھپی اس کے دیباچہ میں لکھا ہے :-

”مئی گوید مؤلف این رسالہ محمد فخر الدین خان المخاطب بہ شمس الامراء غفر اللہ لوالدیہ کہ کتاب اقلیدس“ اگرچہ جادوئی صحیح اصول ہندسیہ است، از وقت براہین و تطویل دلائلش بتدی را بہرہ وافی و طالب را نتیجہ کافی دست نی داد۔ ہذا اکثر در خاطر تلاش کتابے بود کہ اولہ اشکاشش قریب الفہم باشند درین ولا، نسخہ خوب از مایینفات موسی کلارک کہ در زبان فرانسیسی تہ بہ وہ مقالہ بود بہم رسید و دیدم کہ در آن کتاب اعمال اصول اشکال مطہ و مجسمہ بہ دلائل و ضحہ قریب الفہم کہ از ان کار بائے اعمال بہ آسانی می بر آیند، مرقوم اند، لہذا نظر قائمہ طالبان آن کتاب را از زبان فرانسیسی بہ زبان فارسی مرقوم نموده شد، تا در روزگار موجب یادگار باشد۔“

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نواب صاحب کو فرانسیسی زبان پر بھی کافی عبور حاصل تھا

دوسری کتاب ”فنِ جاں“ پر ہے جو سلسلہ میں لکھی گئی، جس کے دیباچہ کی چند سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں ”مؤلف این رسالہ محمد فخر الدین خان المخاطب بہ شمس الامراء غفر اللہ ذنوبہ و ستر عیبو بہ، برابر باب این فن و مہندسین و مصورین بہرین می گرداند کہ از مدتے مکتوب خاطر بود کہ ”در فنِ جاں“ اچھے اعمال و اشکال مستخرجہ اہل کمال سنات

مال بلا لحظہ رسیدند و ہرچہ از مزاولت مشق این مولف صورت استخراج یافتند ہمہ را بقید قلم آورد تا طالبان این فن را فائدہ نمازہ و مسرت بے اندازہ حاصل آید۔ بحال بہ کرم ایزد متعال در سال ۱۲۲۲ یک ہزار و دو صد و چہل و چہار ہجری نبوی از دست داد فرستے رسالہ بہ طریق اختصار مرتب ساخت۔“

نواب محبے رفیع الدین خاں بہادر اپنے والد کی زندگی ہی میں اپنے علم و فضل اور تصنیف و تالیف کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں جو کتا ہیں شمس الامراء میں چھپیں وہ زیادہ تر انہیں کی فرمائش اور دیکھی گئی تھیں لکھی گئی تھیں چنانچہ بعض کتابوں میں وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ صاحبزادہ نواب محمد رفیع الدین خاں عمدہ الملک بہادر کی فرمائش پر لکھی گئی۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد یہ جہاں ان کے خطابات اور جاگیرات کے زیادہ حصہ کے وارث ہوئے ان کا علم فضل اور شوق تصنیف و تالیف بھی زیادہ تر انہی کے حصے میں آیا۔ فرق یہی تھا کہ شمس الامراء ثانی نے زیادہ تر فارسی میں لکھا اور رفیع الدین خاں شمس الامراء ثالث نے اردو میں۔

نواب رفیع الدین خاں کی جو کتا ہیں اس وقت تک دستیاب ہوئی ہیں ان میں اکثر ایسی ہیں جو ان کے والد کی زندگی میں لکھی اور چھاپی جا چکی ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر کرتی ہے کہ نواب فخر الدین خاں کے زمانہ حیات میں دوسرے مصنفین اور مولفین کی جو اردو کتا ہیں نواب شمس الامراء کے سگی چھاپے خانے میں چھپیں اور جن میں سے بعض کے نام ان کے تذکرہ میں درج کر دیئے گئے ہیں ان کی تصنیف اور اشاعت و طباعت میں اپنے والد کی دیکھی کے ساتھ نواب رفیع الدین خاں بہادر کی توجہ اور شوق برابر کے شریک رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ رفیع الدین خاں بہادر کی لیاقت و علمی شغف سے ان کے والد بھی واقف تھے اور اس کی قدر کرتے تھے چنانچہ اپنی مشہور کتاب ”شمس الہندسہ“ میں انہوں نے اپنے فرزند کی نکالی ہوئی شکلوں کو بھی داخل کر لیا اور اس کا ذکر اپنے دیباچہ میں اس طرح سے کیا ”چند اشکال مستخرجہ بر خور دار محمد رفیع الدین خاں بہادر عمدہ الدولہ اطالہ عمده و رافہر مقابلہائے سفاقت انہا بہ تفصیل مرقوم ساختہ۔“

اردو زبان میں تصنیف و تالیف کرنے اور دوسروں سے لکھوانے کی وجہ سے عہد حاضر میں نواب رفیع الدین خاں بہادر

کی شخصیت کو بہت اہمیت دی جاسکتی ہے کیونکہ وہ اپنے والد کے بعد پہلے آدمی ہیں جنہوں نے مغربی اور جدید ترین علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوششیں کیں ان کی نسبت یہ مختصر سا مضمون ناکافی ہے۔ ان کی اردو تصنیفات اس قابل ہیں کہ ان پر طلحہ کتابیں لکھی جائیں۔ ہماری کتاب میں ان کا تفصیلی ذکر موجود رہے گا۔ یہاں ہم صرف چند کتابوں کے نام درج کر دیتے ہیں۔

- | | | |
|-----------------------|--------|-------|
| (۱) رسالہ علم ہندسہ | مطبوعہ | ۱۲۵۱ھ |
| (۲) رفیع الحساب | " | ۱۲۵۲ھ |
| (۳) تہککہ رفیع الحساب | " | ۱۲۵۳ھ |
| (۴) رفیع البصر | " | ۱۲۵۴ھ |
| (۵) رفیع بصفت | " | ۱۲۶۹ھ |
| (۶) رفیع التریب | " | ۱۲۸۲ھ |

ان مطبوعہ اردو کتابوں کے علاوہ نواب رفیع الدین خاں بہادر شمس الامراء ثالث کی تصنیفات میں کئی قیمتی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں "رسالہ شریح" خاص کر قابل ذکر ہے۔

نواب رفیع الدین خاں بہادر کی لکھائی ہوئی یعنی حسب حکم اور حسب فرمائش کتابوں کے تذکرہ کے لئے بھی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ ہماری کتاب میں ان کی تفصیل مندرج رہے گی۔

دوسرے فرزند محمد رشید الدین خاں بہادر کو بھی علمی شوق تھا چنانچہ انہوں نے ایک تاریخ "رشید الدین خانی" لکھوائی جو اس وقت دکن کی تاریخوں میں بڑا درجہ رکھتی ہے۔

اسکے مولف، غلام امام خاں المتخلص بہ جمال ابن محمد تہوور خاں ہیں جنہوں نے ایک کتاب میں نواب صاحب معز کے حکم تالیف کیا کتاب کا نام بھی خود تاریخ ہی ہے اور ان کے ایک شاگرد گلزار علی خاں شوش نے تاریخ ہند سے بھی مادہ تاریخ نکالا ہے۔ کتاب مولف کی زندگی ہی طبع خورشیدیہ مطبعہ ہوئی۔ اور ۱۲۵۵ھ تک لکھنؤ کی طباعت و مکتبہ کو پہنچی اسکے (۶۷) صفحے ہیں اس کتاب کی وقت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گارساں دی تاسی جیسے شخص نے اپنے خطبات میں اس کی بڑی مدح سرائی کی ہے

اس کتاب کے مولف نے اور دو سرنی کتابیں "مدحہ شمس" اور "تاریخ خورشید جاہی" وغیرہ بھی لکھی ہیں۔

تیسرے فوجد محمد بدر الدین خاں بہادر جیسا کہ لکھا جا چکا ہے بہت جلد انتقال کر گئے، انہیں آرت اور خوشنویسی وغیرہ سے بھی کچھ پٹی تھی۔ چنانچہ ایک مرقع موجود ہے جس میں انہوں نے ناخن سے نہایت اعلیٰ درجہ کی تصویریں اور قطعے وغیرہ تیار کئے ہیں اس عجیب و غریب مرقع کی تاریخ اس زمانہ کے مشہور شاعر فیض نے اس طرح لکھی ہے جو اس مرقع کے آخر میں مندرج ہے۔

از ناخن خود مظلم الملک آرہست چو این چنین مرقع
اے فیض نشن بجفت مانی ناخن بدلم زو این مرقع

اس مختصر سے زمانہ حیات میں انہوں نے کئی کتابیں تالیف کیں۔ انہیں شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا جس کی یادگار میں اپنا ایک دیوان چھپوڑا ہے جس کی نسبت ہم نے اپنی کتاب میں تفصیل سے تبصرہ کیا ہے۔ ان کی تمام تصنیفات میں شجرہ آصفیہ جس کا تاریخی نام "وقائع معظّمہ" ہے بہت مشہور ہے جس کو انہوں نے ۱۱۵۷ھ میں مرتب کیا۔ چنانچہ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں:-
"اما بعد نصف العباد محمد بدر الدین خاں بہادر المخاطب معظّم الدولہ، خلف امیر کشمیر الامراء بہادر دوم مظلمہ
بہ تخریر این مسطور کہ در ذکر حسب و نسب مغفرت مآب آصف جاہ اول و اولادش و عشایر و آقارب نواب مذکور یہ سعی
بیار و تلاش بے شمار و آن چہ کہ در یافت رسید بہ پاس خاطر مولوی میر حافظ شمس الدین فیض و میر عبد اللطیف حکیم
پر در ختم۔ در عہد انیت ہمد آصف جاہ رابع نواب ناصر الدولہ بہادر خلد اللہ ملکہ و زاد عمرہ و اجلالہ کہ بہ دو واسطہ
ذبیحہ نواب مغفرت مآب اند۔ در ماہ ربیع الاول ۱۱۵۷ھ ہر ایک ہزار و صد و پنجاہ و دو ہجری بہ یک اصل و سہ
نوع ترتیب دادہ موسوم بہ "شجرہ آصفیہ" و دیگر نام این رسالہ کہ مادہ "تاریخ این است" "وقائع معظّمہ"
و اللہ الموفق بالانجام و العین بخیر الافتتام۔"

نواب بدر الدین خاں کے بعد بھی خاندان شمس الامراء کے متعدد افراد نے علمی سرپرستی کی اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی لی مثلاً نواب محترم الدولہ بہادر سراسر ماہیہ بہادر سرخو خورشید جاہ بہادر و سہر و قارا الامراء بہادر وغیرہ مگر ان سب کے ذکر کے لئے کسی اور مضمون کی ضرورت ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ہماری کتاب میں تفصیل درج رہے گی۔

مفلس

۱۔

مخدوم محی الدین بی۔ اے متمدن بزمِ اردو

بجلیاں ٹوٹ پڑیں کشت پہ حال میں ہوں صید بے مہری عالم ہوں جلا دل میں ہوں
عقلیں جیراں ہیں وہ عقدہ مشکل میں ہوں لہریں خوشیوں کی نہ دیکھی ہوں سال میں ہوں

رقصِ شعلہ ہوں میں بے تابی بسمل میں ہوں

منہ جو رکے نوشاہ او سرمایہ دار دہجیاں دامنِ دولت کی اڑانے دے مجھے

————— (۲) —————

رعد ہوں برق ہون چمن ہوں پارہ ہوں نہیں خود پرستار خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردنِ کلم کے طمس سے وہ آرا ہوں میں خرمین جو رطلاد سے وہ شرارہ ہوں میں

بحرِ تخریب کا ناپید کنارہ ہوں میں

میری فریاد پر اہلِ دولِ انگشت بہ گوش؟ لاتبرخون کے دریا میں نہانے دے مجھے

————— (۳) —————

سر پر تختِ اربابِ زماں توڑوں گا شورِ نال سے درِ ارض و سماں توڑوں گا

توڑو پرو رویش اہل جہاں توڑو ننگا
عشرت آباد امارت کا مکاں توڑو ننگا
گر زحیٰ سے سر باطل کا گماں توڑو ننگا
توڑو الونگا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو نیچے عسرت سے چھڑانے دے مجھے

(۴)

رسم کہنہ کو نہ خاک ملانے دے مجھے
برق بن کر بت مٹی کو گرانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خواب فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
کیا ہوں میں؟ ٹھیرا! ذرا ہوش میں آنے دے مجھے
کیا ہوں اک آگ ہوں ہاں ایک کپتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے



طور

اشترا

مخدوم محی الدین بی۔ اے معتمد بزم اُردو

یہ ہیں کھینٹوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

یہ ہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے

یہ ہیں کی جورت اظہارِ حروف مدعا میں نے

یہ ہیں کھینٹوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

دلوں میں از دحام آرزو لب بند رہتے تھے

جب تیوں پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے

یہ ہیں کھینٹوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جامِ شراب آتا

مجھے رنگینوں میں رنگنے رنگینِ سحاب آتا

یہ ہیں کھینٹوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

جیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پر لغزشیں تھیں

فضا میں منتشر رنگین بدن کی لغزشیں تھیں

رباب دل کے تاروں میں سلسل جن جنشیں ہوتیں خفا و راز کی پر لطف باہم کششیں ہوتیں

.. یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

ہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زربین سیغے میں فناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں

جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں مئے دو آتش کے سے فرے آتے تھے جھینے میں

.. یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی سرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی

ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی ملک جھولا جھولاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

.. یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

ناب و کھیت باقی ہیں نہ وہ آبِ ال باقی مگر اس میں رفتہ کا ہے اک دھندلا نشان باقی



وَجْدَانِيَاتُ

از

سکند علیقا و جد متلم بی۔ اے عثمانیت

وصل میں وہ منزا کہاں تھا جو فراق یاد میں
فصل خزاں قریب سے حالت گل عجیب سے
پوچھ نہ حال آشناں کس میں ہے طاقتِ بیاں
لاکھ ہوں نظم یا ستم درویشینگے کیوں قدم
ظلم ہیں ان پہ بیشتر جن پہ کرم کی ہے نظر
واے دریدہ دہنی اگل جو چنے تھے گر گئے

جیت کٹی نہ زندگی کیوں تیرے ہتھار میں
درد کی ٹہنیں آجلی ز من سہ ہزار میں
ضد تو سن سہ ہزار باگ لگی بہار میں
بس میں پڑے ہیں دل کے ہم بدل تری اختیار میں
زنگ و فاکس قدر جو ستم شعار میں
خاہتی خار رہ گئے دامن ساز نار میں

و جد خیال آخرت دل میں نہ آسکا کبھی

عرا خیر ہو چسلی عشق کے کار و بار میں

وَجْدَانِيَات

از

سکندر علی خان وجد متعلم بی۔ اے۔ عثمانیہ

آتا ہے شبِ نعم میں بہت نام تیرا یاد
صحرا میں جو کانٹوں نے نکالیں میں زہا
دنِ عیش کے کٹے ہیں پتھر میں تونگی
شکوہ کیا چماں شکنی کا تو وہ بولے

سچ ہے کہ اٹھے درو تو آتی ہے دوایاد
شاید اُنھیں آیا ہے کوئی آبلہ پایاد
افتاد جو پڑتی ہے تو آتا ہے حسدایاد
کبکھت یہ وعدہ نہیں رہتا حسدایاد

اے وجد ترے خون نے وہ رنگ جمایا
بھولے سے بھی آیات انہیں رنگِ حسدایاد



یادِ ایام

از

محمد عبدالحی خان نقی شارق - متعلم سال چہارم

بادل کا گھر کے آنا ترغیب میکشی کی
کھلنا چین میں گل کا تصویر ہے منسی کی
سبزہ کا لہلہا نا تعبیر بیسکی کی
شاعروں کی نرم جنبش انگڑائیاں کسی کی

صحن سپہن نہیں ہے محفل ہے عاشقی کی

ہم سیر کر رہے تھے ڈالے گلے میں ہائیا
دل پاک تھے ہمارے معصوم تمہیں نگاہیا
ہوتے تھے عہد و پیمان باہم سدا نیا
چاہیں اگر کسی کو تو بس تمہیں کو چاہیں

دل بھولتا نہیں ہے روداد گم سنی کی

نظریں بچا رہے ہیں آنکھیں چوراہے میں

اہر وہ پہل پڑے ہیں گو مسکرا رہے ہیں
کیوں آپ ہی وہ مجھ سے شرمای جا رہے ہیں
بہنجی ہیں کیوں نگاہ میں کیوں لب چہا رہے ہیں

و اللہ مجھ سے پوچھو پہچان بے رخی کی
تاروں میں کیوں دک ہے کیوں برق میں جھلکے
کیوں ہی زمین ساکن گردش میں کیوں فلک ہے
کیوں نازن ہی بلبل کیوں پھول میں بہک ہے
ہی خار میں کٹک کیوں کیوں تلب میں کٹک ہے
اے کاش کوئی کر دے تفسیر زندگی کی

وہ چاندنی کا منظر، وہ موج زن سمت در
پیش نظر بوریں جام شہرابِ احمر
بکھائے زلف مشکیں اپنے جبین و رخ پر
کہ بے سواب نظریں گدشہ مسار تیور

مت پوچھنا شین تو بدستیاں کسی کی
یہ پُرشاب سنبھلیں آنکھوں میں رنگِ مستی
تو بان ہو رہی ہے سو جان سے سے پرستی
بکلی کا چمکنا یہ رات مینہ برستی
تو یہ ہے یا ہے کوئی بے باد بان کشتی
نرمی پہ چھوڑتا ہوں دریا سے میکشی کی

میں

از

میر سعادت عسلی رضوی بی۔ اے۔ صدر بزم اردو کلید جاموہ نقا

جس کی تقدیر مخالف ہو وہ تدبیر ہوں میں
شرح کرنا میری ہستی کا بہت مشکل ہے
رنگ بجز نابیرے نقاشس کو منظور نہیں
مانع طوف حرم ہے میرا احساس خودی
مجھ میں کیا وفیر حکمت ہی کوئی کیا جانے
آئینہ دیکھنے والے نے بہلا کیا دیکھا
اشرف خلق بنا یا ہے کسی نے مجھ کو
زندگی ہستی مودوم کا ایک جوابیہ گران

جو نہ مٹتی نہ بدلتی ہے وہ کس پر ہوں میں
سینکڑوں جس میں ہیں اجمال و تفسیر ہوں میں
خون ہوتے ہوئے ارماتوں کی تصویر نہیں
دست قدرت کی بنائی ہوئی تعمیر ہو نہیں
بے زبان بولنے والے تیری تقریر ہوں میں
چلتی پھرتی کسی نقاشس کی تصویر ہو نہیں
ماسوا اللہ میں گونجی ہوئی تکبیر ہوں میں
موت کہتی ہے اسی خواب کی تبیر ہوں میں

حمبر گر حشر کا دن دور نہیں اے صاویق
وہ نہ بخشنے تو کہوں کونسی تفسیر ہوں میں

پروانہ کی زبان سے

از

میر سعادت علی رضوی۔ بی۔ اے۔ صدر نژوم اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۱)

یہ نور کی پستی نوری ہے
اور اینے دامن کی پوری ہے
ہے شعلہ فشانہ فی کام اس کا
اور شمع فروزاں نام اس کا
مخفل کی یہ زیب و زینت ہے
کیا چاند سی اس کی صورت ہے
وہ بجز بیتِ محبت میں کامل
ہیں ذوقِ شہادست میں کامل
وہ میری پرستش کرتی ہے
میں اس کی عبادت کرتا ہوں

وہ مجھ کو جلا کر جلتی ہے
میں جان کے اس پر مرنا ہوں

— (۲) —

بے عیب ہے اس کا سیم بدن
مخمس رخ انور سے روشن
خاموش ہے ظاہر میں گویا
آتش کا ہے لیکن پرکالہ
فائوس کے پردے میں ہے نہاں
اور نور حجابوں سے بھی عیاں
سود امیرا مجسمنوں کیا جانے
یہ ذوق تپش یلی میں کہاں
وہ درد محبت سہتی ہے
میں اس سے الفت کرتا ہوں
وہ مجھ کو جلا کر جلتی ہے
میں جان کے اس پر مرنا ہوں

— (۳) —

مطلوب ہے وہ میں طالب ہوں
وہ روح ہے اور میں قالب ہوں
میں گوش سماعت ہوں ہمہ تن
خاموشی ہے اس کا طرز سخن

گلیں سے ہو سراس کا قلم
 قدموں پہ نگے میرا دم
 یاں شور پر پرواز نہیں
 بننے میں وہاں آواز نہیں
 گہل گہل کے وہ پانی ہوتی ہے
 میں ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوں
 وہ مجھ کو جلا کر جلتی ہے
 میں جان کے اس پر مڑتا ہوں



بزمِ اردو کی ادبی جدوجہد

از

ابوالخیر سید ابراہیم حسینی صاحب - بی۔ اے

بزمِ اردو کو قائم کئے ہوئے آج تین سال ہوتے ہیں اس عرصے میں بزم کے اراکین نے جو جو علمی و ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کو اجالا یہاں بیان کیا جاتا ہے جس سے واضح ہو گا کہ اس قلیل عرصے میں اراکین بزم کس قدر سرگرمی سے میدانِ ادب میں کام لیں رہے اور ہیں۔

تنقید و تحقیق

یوں تو ہمارے کلیہ کے اکثر طالب علم تحقیق و تنقیدی مضامین لکھتے رہتے ہیں لیکن ہماری بزم کے اراکین خاص طور پر اس شعبہ میں ممتاز ہیں۔ کئی کتابیں اس تین سال کے قلیل عرصے میں لکھی گئیں جن سے چند شائع ہو چکی ہیں اور اکثر زیرِ ترتیب یا زیرِ طبع ہیں اور عنقریب منظرِ عام پر جلوہ گر ہو جائیگی۔

ورد سورتھ:۔ یہ کتاب رحین صاحب نے لکھی ہے جس کی خوبی متعلق بے شمار ہیں وصول ہوئیں اور اردو کے معیار

رسالہ میں منتخبیں چھپ چکی ہیں اردو دان حضرات و رڈ سورتھ کی شاعری سے بہت کم واقف تھے اس کتاب کی وجہ سے بھی طرح ریزناس ہو گئے یہ کتاب ہر لحاظ سے اچھی ہونے کے علاوہ اردو والی طبقے پر ایک احسانِ عظیم ہے (طبع ہو چکی ہے) سوانحِ عمری :- یہ کتاب بھی حیرن صاحب کی لکھی ہوئی ہے جس میں اس فن کے اصول و ضوابط کے ساتھ اردو سوانحِ عمریوں کے ارتقا پر بھی بحث کی گئی ہے۔ آخری حصے میں اردو سوانحِ عمریوں پر ایک تفصیلی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

تیارِ سخن ادبِ انگریزی :- یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی بالکل پہلی کتاب ہے۔ اب تک تیارِ سخن ادبِ انگریزی پر کوئی کتاب اردو میں نہیں تھی اس کام کی ابتدا سابق محترم بزمِ زاہد علی صاحب کمال کے ہاتھوں ہوئی تھی انھوں نے اس کام کو تشکیلیہ کے عہد تک انجام دیا۔ لیکن ان کی صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ کام بھی حیرن صاحب کے سپرد کیا گیا جو بعض اہم مقامات کو پورا کر چکا ہے۔ کتاب زیرِ طبع ہے۔

دردِ اور اس کی شاعری :- غلام محمد خاں صاحب صدر بن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ کی یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں درد اور ان کے متعلقین کی سوانحِ حیات ان کی تصنیفات ان کے شاگردوں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں اور دوسرے حصے میں درد کی شاعری اور ان کے اصنافِ سخن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خانصاحب کی یہ ایک کامیاب تحقیق ہے۔

یوسف ہندی قیدِ فرنگ میں :- اس میں سن بن شبیر صاحب نے غالب کے قید ہونے کے واقعات کو تحقیقی معلومات حاصل کرنے کے بعد نہایت محنت و جانفشانی سے لکھا ہے۔ ان کی یہ ابتدائی کوشش بہت کامیاب رہی (طبع ہو چکی ہے) وکن میں مرثیہ گوئی :- سعادت علی صاحب رضوی (صدر بزمِ اردو) کی یہ کتاب زیرِ ترتیب ہے۔ توقع ہے کہ بہت جلد چھپ جائیگی جس سے اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہو گا۔ رضوی صاحب نے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

تہیدی - ابتدائی - متوسط - عروجی - تہیدی حصہ میں مرثیہ کی تعریف ہے عربی فارسی مرثیہ پر تعقیدی اور اردو مرثیہ کی ایک عام نظر ڈالی گئی۔ ابتدائی حصے میں سلطنتِ بجا پورا اور گولکنڈہ کے آغاز و عروج اور اس زمانے کی مرثیہ نگاری کے متعلق لکھا

گیا ہے۔

متوسط دور میں وکنی سلطنتوں کے زوال اور اس وقت کے مرثیہ گوئیوں کا حال درج ہے۔

آخری حصے میں سلطنتِ آصفیہ کے عروج اور اردو و مرثیہ کی ارتقائی کوششوں کا حال جو ابیس کے دن آنے کے بعد سے آج تک جدید و کئی مرثیہ گو شورا کا تذکرہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ کر کے رضوی صاحب نے قوتِ تحقیق و تدقیق کا ثبوت دیا ہے ان کی محنتِ علمی راہ میں قابلِ مبارکباد ہے۔

ٹیکور :- مخدوم محی الدین صاحب (معتد بزم اردو) کی یہ کتاب ٹیکور کی شاعری اور اس کی زندگی سے متعلق ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرِ عظیم کی ابتدائی زندگی۔ اس کے کلام پر تنقید اور تعمیری کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض اس کی زندگی اور کلام میں مطابقت کرتے ہوئے ان تمام واقعات کا اظہار کیا گیا ہے جس سے سرراہ بند رانانہ کی زندہ اور حقیقی جاگتی تصویر پڑھنے والے کے پیش نظر ہوتی ہے اور یہی سوانح نگار کی بڑی کامیابی ہے۔

قصائدِ نصرتی :- سید علی صاحب نے اس تنقیدی کتاب میں اپنی محنت اور کاوش کا پتہ دیا ہے اور حسبِ ذیل سہولیات فراہم کی ہیں (۱) صنفِ قصیدہ کی تحقیق و تاریخ (۲) نصرتی اور موجودہ کہنی زبان کی سانی خصوصیتیں (۳) نصرتی کا خوبیاں اور خامیاں (۴) فارسی اور اردو کے دیگر قصیدہ گو شورا سے مقابلہ۔ (۵) نصرتی کی حیات۔ آخر میں مترادف اور حل طلب الفاظ کی فہرست بھی دی ہے۔ سید علی صاحب کی یہ خدمت قدیم اردو ادب کی زندگی کا باعث ہے۔

شمس الامراء :- شمس الامراء اور ان کے ادبی ضعف سے کون واقف نہیں۔ نواب صاحب کو علم ہندسہ سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ اس فن میں خود نہیں کی تصانیف ان کے کتب خانہ میں موجود ہیں لیکن ان میں سے نہ کوئی کتاب منظر عام پر آئی اور نہ ان پر اب تک کوئی مضمون لکھا گیا۔ ان کے پوتے اور چارے بزم کے ممبر دو امی نواز محمد ظہیر الدین خاں صاحب نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے۔ شمس الامراء کے ادبی کارناموں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں جو بہت جلد مکمل ہو جائے گا۔

ترجمے

سید الانبیاء :- کارلائل کے دوسرے پلجر **HEROES AND HERO WORSHIP** کا ترجمہ ہے جو عظیم خاں صاحب نے بڑی محنت سے سلیس زبان میں کیا ہے۔ کتاب طبع ہو کر نہایت مقبول ہو چکی ہے۔

رہنمائے صحت :- گاندھی جی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ جو عظیم خاں صاحب کی یہ محنت بھی قابلِ داد ہے۔

گولڈ اسمتھ کے خطوط :- سر فراز علی صاحب کی یہ ابتدائی کوشش ہے جو کتاب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ ترجمے میں اگرچہ کچھ غامبیاں رہ گئی ہیں لیکن مترجم کی محنت اور سعی قابل ستائش ہے۔

وکار آف وکیفیلڈ - جین صاحب نے گولڈ اسمتھ کی اس مشہور ناول کا ترجمہ شروع کیا ہے نصف سے زیادہ کتاب اردو میں منتقلی ہو چکی ہے۔ مترجم کی یہ کوشش کہ جہاں تک ممکن ہو ترجمہ کا اسلوب بھی مصنف کتاب کے اسلوب سے متاثر ہے ابھی سے کامیاب نظر آتی ہے۔

ناول

نقاب کی سرگرمیاں مہر اور خون :- یہ دونوں ناول عزیز احمد صاحب کی تصنیف سے جدید ناول نگاری کے اچھے نمائندے ہیں اور مصنف کی تخلیقی قوت کے زبردست گواہ ہیں (زیر طبع)

سوز الفت :- ڈو ما کے ناول ٹیڈی آف دی کچی بیا "کا ایک آزاد ترجمہ ہے جس کو اعظم خاں صاحب نے جدید آباؤ کے ماحول اور کرداروں کے ساتھ اپنی زبان میں پیش کیا ہے۔

افسانے

جین صاحب - عزیز احمد صاحب - غلام محمد خاں صاحب - اعظم خاں صاحب - اختر حسن صاحب - بادشاہ علی صاحب اور فخر الدین صاحب ہماری بزم کے وہ سرگرم اراکین ہیں جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ اور ان کے افسانے وقتاً فوقتاً ہندوستان کے اکثر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان افسانوں کی امتیازی خصوصیت علاوہ زبان کے ان کا منہ بے طرز ہے۔

ڈرامے

ہماری بزم کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس کے وجود میں آتے ہی کالج میں ڈرامہ سٹیج کیا جانے لگا لیکن جس سال ہماری بزم قائم ہوئی اسی سال عزیز احمد صاحب کا لکھا ہوا ایک شوق ڈرامہ کالج کے دن "جین بوم کھیہ کے موقع پر

یہ سٹیج کیا گیا اور بہت کامیاب رہا۔ مکمل ڈرامہ مجلہ عثمانیہ میں شائع ہو چکا ہے جس کا معیار مصنف کی قابلیت کا ثبوت ہے۔ اس کے بعد عزیز احمد صاحب نے ”مستقبل“ ”خطرناک ملاقات“ اور ”عمر خیام“ (جو پورا نظم میں ہے) یہ تین ڈرامے لکھے۔ اسی سال میر حسن صاحب اور مخدوم محی الدین صاحب کی باہمی کوشش کا نتیجہ ایک سوشل ڈرامہ ”ہوش کے ناخن“ کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ ڈرامہ پہلے یوم کلبہ کے موقع پر اور بعد انجمن طلیسائیں کی امداد میں سٹیج کیا گیا اور دونوں مرتبہ نہایت کامیاب رہا۔

میر حسن صاحب نے ”پرویں“ نامی ایک اور ڈرامہ لکھا ہے جو ٹی کالج کے طلبائے قدیم کے سالانے میں چھپ رہا ہے۔

غلام محمد خاں صاحب نے بھی ”حسن سلوک“ ایک سوشل ڈرامہ لکھا ہے جو عنقریب شائع ہو جائے گا۔

ڈرامے لکھنے کے علاوہ ادکاری میں بھی ہماری بزم کے ارکین خاص دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ اس خصوص میں مخدوم محی الدین صاحب کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ جو ادکاری میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور اب تک خراج سخن کے ساتھ ساتھ کئی انعامات حاصل کر چکے ہیں۔

شاعری

گو یہ چیز فطری ہے جس کے لئے ضروری نہیں کہ شاعر ادب کا طالب علم ہی ہو۔ لیکن ہماری بزم کے ارکین اس صنف میں کافی دلچسپی لیتے ہیں اور آئے دن نظمیں اور غزلیں کہتے رہتے ہیں اس سلسلے میں سب سے پہلے علی حسنین صاحب زبیر کا نام آتا ہے جو کافی غزلیں لکھنے کے بعد اب نظموں کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ بلند خیالی۔ مضمون آفرینی اور سادگی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

مخدوم محی الدین صاحب جنہوں نے حال ہی میں شعر کہنا شروع کیا ہے زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ فطرت سے کس قدر قریب ہیں۔

اختر حسن صاحب اختر۔ عبدالحی خاں صاحب شارق۔ محمد صدیق صاحب برق۔ شعیب احمد صاحب حزیں

سکندر علی صاحب وجد - فخر الدین صاحب جمیل بھی غزل گو ہیں جن کی اکثر غزوں میں مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں

ارکین کی ادبی مصروفیتوں پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بزم اردو کے طلباء تنقید اور تحقیق کی طرف زیادہ مائل ہیں جس کی وجہ سے ان کے ادبی ذوق میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے امید ہے کہ مستقبل قریب میں بزم اردو کلکتہ جامعہ عثمانیہ کے ارکین اور ان کی تصنیفات ادبی دنیا میں پائیدار شہرت حاصل کریں گی اور اردو کا ادبی ذخیرہ ان کی وجہ سے مالا مال ہوتا جائیگا۔



خطبہ صدر

جناب صدر و معزز حاضرین!

بڑی یا انتخابی رواج کے مطابق مجھے سب سے پہلے ارگن بزم اردو کا شکر یہ ادا کرنا چاہئے جن کی رلے شماری نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنی بزم کا صد منتخب کریں میں اس کو ان کی قدردانی اور اپنی عرصہ افزائی سمجھ کر خلوص دل سے قبول کرتا ہوں اس سال یہ بارگراں میرے سر ہے میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ جن و خوبی اپنے تمام فرہض انجام دے سکوں گا اور بزم چند قدم آگے بڑھ سکیگی لیکن جہاں تک امکانی کوشش کا تعلق ہے میں اس کو اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں کہ بزم کی ترقی کا ساعی رہوں گا۔ اس بزم کی نوعیت سے تو آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ یہ آج اپنے تیسرے سال میں قدم رکھ رہی ہے اس دو سال کے عرصہ میں اس نے جو نمایاں خدمتیں انجام دی ہیں ان کے تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بین اٹھلیاتی ادبی مصروفیتوں میں بزم نے ہر اعتبار سے بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا ایک اہم مقصد (جیسا کہ آپ حضرات واقف ہیں) ہارو زبان کی نشر و اشاعت اور ترقی ہے۔ بزم اردو جو طلبہ کی ایک مختصر سی مجموعی کوشش ہے طلبہ کی حد تک اپنا وہی مطمح نظر رکھتی ہے جو ہمارے ہی جامعہ کا ہے۔

اگر رسالوں کی کثرت۔ اخبارات کی بہتات اور نئی نئی کتابوں کے اشتہارات کو دیکھ کر اندازہ لگائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کو بہت کچھ فروغ ہو چکا ہے۔ لیکن غور کیجئے تو حقیقت میں ایسا نہیں ابھی ہمارے ملک میں اردو ادب کی وہ قد جس کا وہ تخی ہے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اکثر ادیب اپنے سینوں کی دولت اور دماغوں کی قوت سے بیخبر ہیں اور اردو خوان دنیا اس اصول سے ناواقف ہے کہ ادب سے کب سے کب سے کام لگ سکتے ہیں۔ ایک ادیب پر اپنے جوہر صلی کی حفاظت کرنا فرض

ہے اور اس کو اس حفاظت میں مدد دینا اہل ملک کے لئے لازم ہے۔ اسی خیال کے مدنظر بزم اردو کی طرف سے ایک جلد کی اشاعت کی تجویز بدست سے زیر غور تھی۔ بزم کی جلاہم مجاہدیز میں سے یہی ایک تجویز تھی جو اب تک عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ اس سال میرا سب سے پہلا فرض یہ ہو گا کہ اس رسالہ کے اجرا کی کوشش کروں یہ ایک خالص معیاری ادبی جلد ہو گا۔ جو سال میں ایک مرتبہ سانا مہ کی شکل میں نکلا کر گیا جس میں نہ صرف ارکین بزم کی سال بھر کی علمی و ادبی کاوشیں اور تحقیقات درج ہونگی بلکہ دوسرے انشا پردازوں کے ایسے بلند پایہ مضامین بھی شامل ہونگے۔ جن سے ارکین کے ادبی ذوق میں اضافہ اور عام اردو ادب میں ترقی ہوگی۔ وقت یہ ہے کہ کسی چیز کا اجرا و آغاز آسان ہے لیکن اس کا قیام مشکل ہو جاتا ہے۔ اس قیام کے لئے ضرورت اس کی ہے کہ عوام میں اس کام سے دلچسپی پیدا کی جائے اور عوام کی دلچسپی کے لئے بعض اوقات میبار کی قربانی ضروری ہو جاتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کا ساتھ ساتھ لے چلنا ہی مشکل کام ہے۔ امید ہے کہ ملک کے ارباب قلم اس ادبی کام میں ہمارا ہاتھ بٹا کر نکلنے والے حضرات! میرا ایک اور مقصد یہ ہے کہ اس سال سے بزم اردو کی بڑی بڑی اور اہم مصروفیتیں بطور سا لگرہ کے ایک ہی زمانہ میں منعقد ہو کر میں بزم کا سالانہ تقریریں متقابلہ تحریری مقابلہ، مشاعرہ اور تقسیم انعامات ہو کر میں اس سے سب سے بڑا فائدہ دیکھوں گا۔ ان مصروفیتوں کے باعث بزم میں زندگی اور سرگرمی کے آثار مستقل ہو جائیں گے اور ایسے اہم جلسوں کے لئے علیحدہ علیحدہ مختلف اوقات میں جو اہتمام کرنے پڑتے ہیں ان کی گونا گوں زحمتوں سے عہدہ داران بزم کچھ سہولت حاصل کریں گے۔ بین اعلیٰ کی تعاون کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اگر ہم اپنے علمی جلسوں میں نظام کالج اور دوسرے کالجوں کے ادبی انجمنوں کے ارکین اور انفرادی طور پر ادبی ذوق رکھنے والے طلبہ کو مدعو کریں تو بزم روز بروز کامیاب تر ہوتی جائیگی اور اس کی مقبولیت میں ایک اور بات جو میرے خیال میں نہایت ضروری ہے وہ ان مقامات کا سفر ہے جو کوئی ادبی اہمیت رکھتے ہوں یا جہاں کوئی علمی ادبی ادارہ انہی خاص سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اس سلسلے میں زندگی مصنفین سے ملاقات اور ان سے علمی و ادبی موضوعوں پر تبادلہ خیالات بھی ایک اہم اور دلچسپ مصروفیت ہے گی۔

آخر میں حاضرین جلسہ اور خصوصاً ہمارے ہر دلخیز صدر صاحب گلبرگ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان سے اور بزم کے تمام مخلصین کو مبارکبادیں عرض کرتا ہوں۔ ڈاکٹر سعید محمد علی الدین صاحب قادری زور اور جناب عبدالقادر صاحب سروری سے مستند علمی ہونکے جو طرح انہی علم الفرمستی کے باوجود بزم کی مصروفیتوں میں دلچسپی لے رہے ہیں اس لئے بھی اس طرح کی گفتگو

رپورٹ سالانہ

ترتیب

مخدوم محی الدین صاحب معتمد بزم اردو
ہماری کابینہ نے جو حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہی، ۲۷ مہر ۱۳۲۲ء کو جاکزہ حاصل کیا

صدر۔ میر سعادت علی صاحب رضوی۔ بی۔ اے۔

معتد۔ مخدوم محی الدین متعلم سال چہارم

خازن۔ محمد عابدین صاحب " " "

ارکین:-

سال ششم۔ علی حسنین صاحب زیبا

سال سوم۔ فضل الہی خان صاحب

سال پنجم۔ غلام محمد خاں صاحب

سال دوم۔ محمد عسکر صاحب

سال چہارم۔ سید علی صاحب

سال اول۔ خواجہ حمید الدین صاحب

بزم نہالی کابینہ کا ایک کاروباری جلسہ میر سعادت علی جتو رضوی کی صدارت میں ۲۳ آذر ۱۳۲۲ء کو سانیاں منزل (عمارات قدیم) میں سرار پایا تاکہ سال رواں کے موازنہ کے لئے ترتیب دے اور بزم کی ویب پیو کا نظام

تیار کرے۔ جناب صاحبین صاحب نے موازنہ پیش کیا اور بحث و تکرار کے بعد حسب ذیل موازنہ و نظام العمل منظور ہوا:-

کل متوقع آمدنی از میران بزم بحساب فی ممبر (عص) سالانہ	لے
اخراجات متوقع۔ انعامات	ع
مشاعرہ	ع
متفرقات	لے
تدر محفوظ	لے

غیر معمولی جلسے کم از کم دو اور معمولی جلسے کم از کم چار ہوں گے۔

جناب سعادت صاحب رضوی کی یہ تحریکات باتفاق آراء منظور ہوئیں کہ بشرط گنجائش ”یوم بزم اردو“ منایا جائے۔ جس میں بین کلیاتی تحریری و تقریری مقابلے۔ مشاعرہ اور تقسیم انعامات بھی ہونگے۔ بشرط گنجائش بزم کی طرف سے ایک علمی مجلہ پیش کیا جائے جس میں اراکین بزم کے علاوہ دیگر ارباب قلم کے مقالے بھی شریک ہوں اسی میں بزم کی سالانہ رپورٹ بھی شامل رہے۔

بزم کی مالی حالت مستحکم کرنے کے لئے بزم کے دوامی اراکین پیدا کئے جائیں جن کے حقوق یہ ہونگے۔

۱۔ سالانہ مصنفت دیا جائے گا۔

۲۔ یوم بزم میں دعوت دی جائے گی۔

۳۔ حق رائے دہی حاصل ہوگا لیکن مجلس انتظامی کے رکن نہ ہو سکیں گے۔

۴۔ بزم کے مطبوعات ایک تہائی رعایتی قیمت سے دیئے جائیں گے۔

کامیہ ہڈانے اپنے مجوزہ لائحہ عمل پر کاربند ہونے کی پوری کوشش کی سوائے اس کے کہ وہ عمارتی اور مالی مجبوروں کی وجہ سے یوم بزم نہ مناسکی۔ اب یہ آنے والوں کا کام ہے کہ وہ مالی مشکلات پر غلبہ پا کر اس مبارک تروت کو قائم کریں۔

عمومی جلسہ

بزم نے اراکان سلسلہ کو (عاراتِ قدیم کلیہ میں) ایک غیر معمولی جلسہ مولوی عبدالحق صاحب ظم بزم کی صدارت میں منعقد کیا جس میں جناب غریزا احمد صاحب نے اپنا مقالہ "جدید روسی ٹھٹیر" پر حاجو نہایت دلچسپی اور پُر از معلومات تھا۔

اردی سلسلہ کو بزم کا ایک معمولی جلسہ جناب سعادت علی صاحب رضوی صدر بزم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اس موضوع پر بحث کی گئی۔

"ادبیات کا ترجمہ معنی بد اور ناممکن ہے"

موافق۔ مولوی حسین صاحب صدر انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ اور مخالف مولوی محمد کبیری صدیقی صاحب تھے۔ ان کی تقریروں کے بعد دوسرے مقررین نے موافقت اور مخالفت میں تقریریں کیں۔ بہ غلیہ آرا اور مخالفت کا میاب رہی۔ رائے شماری کے بعد مولوی عبدالحق صاحب صدر ناظم بزم نے موضوع کی مخالفت میں کچھ دیر ارشاد فرمایا۔

دوسرا غیر معمولی جلسہ اردی سلسلہ کو منعقد ہوا جس کا موضوع بحث "اہل زبان نے اردو کو نقصان پہنچایا" تھا۔ موافق۔ مولوی غلام غلام صاحب متعلم۔ ایم۔ اے اور مخالف مولوی ابو انجیر صاحب متعلم ساہیاب تھے۔ بہ غلیہ آرا اور تحریک کا میاب ہوئی۔

بزم کے تمام جلسوں میں یہ بات بہت بہت افزائی کی کہ اراکان بزم کے علاوہ دوسرے طلباء نے بزم کی اہمیت کو محسوس کر کے مباحثوں میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔

تعلیمی تفریح

بزم اردو کے مقاصد میں ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ ایسے مواقع فراہم کرے جس سے اراکان بزم

کے ساتھ ترقی تعلقات مستحکم ہوں اور ان کی ذہنی قوتوں کی عمدہ پرہیز میں تربیت ہو چنانچہ اسی مقصد کے تحت بزم ہمارے تعلیمی تفریح کو بھی اپنے نظام عمل میں شریک کر لیا۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو بزم ہمارے طرف سے قلعہ گوگندہ میں ایک تعلیمی تفریح منائی گئی جس میں علاوہ بزم کے اراکین کے دوسری بزموں کے اراکین بھی شامل تھے اور لڑکوں کی تعداد تقریباً ۶۰ تھی۔ اس جماعت نے پہلے قطب شاہی گنبدوں کا معائنہ کیا۔ جہاں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے ان سلاطین کے ادبی شغف اور اردو کی سرپرستی کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قلعہ کے موتی محل کے بارے میں تقریر فرماتے ہوئے اس عہد کے زمانہ و مروجہ حصہ مکان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ جب یہ جماعت بالاحصار پہنچی تو مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے ”بالاحصار“ پر ایک وچپ اور پراز معلومات تقریر فرمائی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا راست طریقہ تعلیم ظہار پر کتنے مفید اثرات ڈالتا ہے۔ یہ طریقہ تفریح اس کاہنہ نے شروع کیا ہمارے والوں سے متوقع ہیں کہ وہ اس مفید روایت کو برقرار رکھیں گے۔

علمی جسد کا اجراء

بزم کے لائحہ عمل میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ بشرط گنجائش ماہنامہ کو علمی جسد کی صورت میں پیش کرے گا۔ تجویز کی عملی شکل آپ کے سامنے ہے جو اراکین بزم وغیر اراکین بزم سب ہی کے علمی و ادبی جدوجہد کا اچھا نمونہ ہے۔ اگر یہ سوال پیدا ہو کہ بزم نے اپنے محدود و مختصر سے موازنہ میں اس کی گنجائش کیسے پیدا کر لی کہ ایسا جسد پیش کر سکے تو اس کا جواب ہمارے کاہنہ کے صدر نواب میر سعادت علی خاں صاحب رضوی ہیں۔ یہ آپ ہی کی کوششوں اور امداد کا نتیجہ ہے کہ ہماری یہ تجویز عملی صورت اختیار کر سکی۔

دوامی اراکین

صاحب موصوف ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آپ کو حسب ذیل دوامی اراکین کے نام نظر آ رہے ہیں

جن کی وجہ سے بزم کی مالی مشکلات میں بڑی حد تک کمی ہوئی۔

- ۱۔ عالیجناب مولوی میرعلی صاحب ناظم دوم فوجداری بلدہ
- ۲۔ عالیجناب نواب سید علیخان صاحب جعفری جاگیر دار۔
- ۳۔ عالیجناب مولوی سید ابوالحسن صاحب رضوی۔ اول تعلقہ ارضلع پریمبی۔
- ۴۔ عالیجناب مولوی میر احمد علی خاں صاحب۔ اول تعلقہ ارضلع راجپور
- ۵۔ عالیجناب نواب سید علی خاں صاحب خلت نواب صارم جنگ مرحوم
- ۶۔ عالیجناب مولوی خورشید مرزا صاحب۔ ناظم معدنیات۔
- ۷۔ عالیجناب نواب مرزا جعفر علی خان صاحب جاگیر دار۔
- ۸۔ عالیجناب مولوی میر تقی علی صاحب۔ محکمہ بند و بست سرکار عالی
- ۹۔ عالیجناب مولوی سید عبدالحکیم صاحب محکمہ بلدیہ حیدرآباد۔
- ۱۰۔ عالیجناب مولوی قدرت احمد صاحب راز (علیگ) مدرس دارالعلوم

بین کلیاتی فی البدیہہ تحریری مقابلہ

بتاریخ ۲۲ آذر ۱۳۲۲ء کالج جامعہ عثمانیہ کی نبی ہمارت میں مسج کے دس بچے بزم اردو کا سالانہ فی البدیہہ تحریری مقابلہ منعقد ہوا۔ ہم مسرت کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ کے ملحقہ کلیات نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ چنانچہ باوجود تنگ وقت پر اطلاع دینے کے ورنگل کالج نے اپنے نمائندے بھیجے۔ کلیہ اناٹ کے سید کے لئے وہیں زمانہ کالج ہی میں انتظام تھا۔ لڑکیوں کی تعداد تقریباً لڑکوں کے برابر تھی۔

موضوع ”عہد عثمانی میں اردو کی ترقی“ تھا۔ ممتحنین مولوی عبدالحق صاحب صدر شعبہ اردو

جامعہ عثمانیہ۔ ڈاکٹر سید محمد الدین صاحب قادری زور پر و فیس اردو جامعہ عثمانیہ اور مولوی سید محمد صاحب پروفیسر اردو کالج تھے۔ ہماری جامعہ کے طالب علم اختر حسن صاحب منظم سال چہارم اس مقابلہ میں اول

اور سکندر علی صاحب وجد دوم آئے۔ رونگ کپ علیہ نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب سابق صدر بزم اور کتابین اول و دوم کو من جانب بزم انعام میں دی جائیں گی۔

کلیہ امانت کے امیدواروں میں جو سب سے زیادہ نمبر حاصل کرے اُسے ہی بزم کی طرف سے کتابیں انعام دی جائیں گی۔

بین کلیاتی فی البدیہہ تقریری مقابلہ

اُسی روز ۲۰ بجے ہی مقام پر سالانہ فی البدیہہ تقریری مقابلہ منعقد کیا گیا۔ تین موضوع دیئے گئے تھے۔ ہر امیدوار کو کسی ایک مضمون کے انتخاب کا حق حاصل تھا۔

۱۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔

۲۔ صحافت کی اہمیت

۳۔ ہوا بازی کی اہمیت

عالیجناب مولوی عبدالمجید صاحب ضابطی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ جناب میرسعادت علی خاں صاحب صدر بزم اور مخدوم محی الدین محمد بزم اس مقابلے کے حکم تھے۔ کلیہ وزنگل کے نمائندے عبدالہی خاں صاحب اس مقابلے میں اول آئے اور رونگ کپ علیہ جناب میرسعادت علی خاں صاحب صدر بزم کے مستحق قرار پائے اور سکندر علی صاحب متعلم جامعہ عثمانیہ دوم آئے جنہیں بزم کی جانب سے کتابیں انعام میں دی جائیں گی۔

ہمارے تمام صرفیتوں میں ہمارے بزم کے نظارہ اور ہمارے شفیق اساتذہ عالیجناب مولوی عبدالحق صاحب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ اور مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے بہت دلچسپی لی جن کا شکر یاد کرنا ہمارا انتہائی خوشگوار فرض ہے۔

بیزان کی رہنمائی کے ہم اپنا کام اس خوش اسلوبی سے انجام نہ دے سکتے۔

عالیجناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ ہمارے بزم کے ساتھ خاص ہمدردی دہی رکھتے اور اکثر ہمارے لئے وقت نکال کر ہمارے جلسوں میں شرکت فرما کر طلبہ نوازی فرماتے رہے ہیں۔ عالیجناب صدر صاحب کا ہر خط خاص مشکریہ اذکر تھے ہوئے اپنی رپورٹ کو ختم کرتا ہوں۔

س س

۳۷۸۶۵۴

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دواہ لہا جائیگا

۵۰/۳/۱۵

